فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	تلاوت کے آداب	خرم مراد	8
قولِ نبی ﷺ	حلاوتِ ایمان کا حصول	بنتِ حوا	13
خاص مضمون	شہادتِ امام حسینؓ	سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ	14
نوائے شوق	ابھی ہم کچھ نہیں کہتے	حبیب الرحمٰن	23
حقیقت و افسانہ	غیرت ہے بڑی چیز	قانتہ رابعہ	26
	اتنا قریب!	افشاں نوید	28
	معمہ	فرحی نعیم	30
	میرے مہربان	فرح وقار	34
	سود بے سود	بشریٰ راشد خان	37
منتخب کہانی	بہتر ایک تہتر	سدرہ سحر عمران	39
یاد داشتیں	ڈاکٹر نبیہہ حسن کے ساتھ پانچ سال	سعدیٰ مقصود	47
سیرو سیاحت	سفیرِ سخن	نصرت یوسف	52
نمایاں خواتین کا تذکرہ	بھوپال کی بیگمات	آسیہ راشد	58
حسن معاشرت	محرم آ گیا ہے	ڈاکٹر شگفتہ نقوی	66
مطالعہ گاہ	میری لائبریری	قانتہ رابعہ	69
پل صراط پر	اللہ کے حکم میں بھلائی ہے	ڈاکٹر فلزہ آفاق	74
محشر خیال	ایک خط	فرحت طاہر	75
نہاں خانہِ دل	آزادی تجھے سلام!	افشاں نوید	77
گوشہِ تسنیم	صفتِ الٰہیہ کا مظہر	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	79

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! اکتوبر اس بار پھر لرزہ خیز رہا۔ دس برس بعد ایک اور شدت کے زلزلے نے ۲۰۰۵ میں آنے والی قیامت کے زخم تازہ کر دیے۔ زیادہ تباہی اور اموات پھر خیبر پختونخوا کے حصے میں آئیں۔ ہمارا یہ صوبہ کئی سالوں سے کئی طرح کی آزمائشوں اور مشکل حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہا ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کا عزم و ہمت ملک بھر کے لیے مثال ہے۔ ہمارے معاشرے کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ مشکل گھڑی میں بے شمار چھوٹی بڑی تنظیمیں، افراد اور ادارے متحرک ہو جاتے ہیں اور ملک بھر سے امداد لے کر متاثرہ جگہوں پر ریسکیو، ریلیف اور آبادکاری کا کام شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح اس کارِ خیر میں سارا ملک شریک ہو جاتا ہے۔ آزمائش کی اس تازہ گھڑی میں اللہ ہم سب کی مدد فرمائے اور مشکل میں گھرے ہوئے ہموطنوں کا ساتھ نبھانے کی توفیق دے۔ محرم الحرام میں تمام تر حفاظت کے باوجود سندھ میں جلوس دہشت گردی کا نشانہ بنا۔ اس سانحے اور زلزلے میں ملک کے طول و عرض میں جتنی ہلاکتیں ہوئیں اللہ ان کے لواحقین کو صبر جمیل دے امین۔ اللہ سے یہ بھی دعا ہے بلدیاتی انتخابات کا مرحلہ بخیر و خوبی طے ہو۔

وزیراعظم نے دورہ امریکہ کے دوران پاکستان میں بھارتی مداخلت کے ثبوت امریکہ کو دیے، جن میں کراچی، بلوچستان اور فاٹا میں عدم استحکام پیدا کرنے کے ثبوت شامل ہیں۔ یہ ثبوت پہلے بھی کئی بار امریکہ کو دیے جا چکے ہیں۔ اب ان ثبوتوں کی بنیاد پر اپنی داخلہ اور خارجہ پالیسیوں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمیں بھارت سے تعلقات کو ان حقائق کی روشنی میں نئے سرے سے استوار کرنا چاہیئے۔ نریندر مودی کی حکومت ابتدا ہی سے جن خطوط پر چل رہی ہے، اس سے اچھی توقعات رکھنا عبث ہے۔ وہ تو اس قدر تعصب کا شکار ہے کہ خود اپنی رعایا کی حفاظت کرنے سے قاصر ہے۔ بھارت میں دادری کے علاقے میں گائے کا گوشت کھانے کے شبہے میں ایک مسلمان کو تشدد کر کے شہید کر دیا گیا تھا۔ اس واقعے پر بنائے گئے کمشن نے رپورٹ پیش کی ہے کہ یہ سب غلط فہمی کا نتیجہ نہیں بلکہ مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ ہوا۔ اس کے باوجود مجرم آزاد پھر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ نفرت اس قدر ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے ممبر پارلیمنٹ کے چہرے پر سیاہی پھینک کر اس نفرت کا اظہار کیا گیا۔ پاکستان کرکٹ ٹیم اور عہدیداران کے ساتھ جو سلوک ہوا اس پر تو سارا ملک سراپا احتجاج ہے۔ یہ تمام حالات بھارت کے پاکستان کے لیے عزائم کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ دورہ امریکہ کے دوران پاکستان کی نیوکلیر صلاحیت پر بھی بات چیت ہوئی ہے۔ ہم اپنی اعلیٰ سیاسی اور

فوجی قیادت سے یہ امید کرتے ہیں کہ ان حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی نیوکلیر صلاحیت پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔

لاہور میں نوعمر لڑکے زین کو ہوائی فائرنگ سے قتل کرنے والے بااثر مجرم کی ضمانت ہوگئی ہے۔ گواہان کو لالچ اور خوف کے ذریعے خرید لیا گیا ہے۔ کراچی میں بہن کو چھیڑنے والے غنڈوں کو منع کرنے والے نوعمر مقتول کے قاتلوں کو بھی بیرونِ ملک فرار کروا دیا گیا تھا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بے بس لڑکی بااثر افراد کے ہاتھوں نشانہ بن کر دہائی دیتی ہے یا خودسوزی کرتی ہے۔ جس ملک میں انصاف الٹا مجرم کو تحفظ دے اور مظلوم کے لیے مذاق بن جائے، وہاں زلزلے اور آفات نہ آئیں تو اور کیا ہو! ہم وہ امت ہیں جس کے نبیِ محترم ﷺ نے صاف تنبیہہ کی تھی کہ تم سے پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئی تھیں۔ اور ہم جانتے بوجھتے ہلاکت کے رستے پر چلے جا رہے ہیں، انہی لوگوں کو دوبارہ اہتمام سے ووٹ دے کر اپنے معاملات کا نگران بنا لیتے ہیں جو قومی دولت لوٹنے کے مجرم ہیں، قاتلوں اور بدمعاشوں کے سرپرست ہیں اور ملک کو اس حال تک پہنچانے کے ذمہ دار ہیں۔ نجانے ہمیں کب سمجھ آئے گی! اب بلدیاتی انتخابات میں اللہ کرے ہم بہتر سمجھ بوجھ کا ثبوت دیں۔

اداریے میں بتول کے کالموں کے تعارف کا سلسلہ فائدہ مند ثابت ہو رہا ہے۔ ایک فوری اثر تو یہ ہے کہ کم از کم مسودے صاف ستھرے ملنے لگے ہیں۔ کمپوز شدہ مسودوں کے لیے ایک بار پھر درخواست ہے، امید ہے کہ ہمارے لکھنے والے اس پر ضرور سنجیدگی سے توجہ دیں گے۔ اس بار پہلے دو کالموں کی طرف توجہ دلا رہی ہوں۔ یہ قرآن و حدیث کے کالم ہیں اور ان کے لیے بنیادی شرائط یہ ہیں کہ کسی ایک دینی موضوع پر قرآن یا حدیث سے رہنمائی کو ایک کالم کی شکل دے دی جائے، آیات، احادیث، تاریخی واقعات اور اقوال کے سو فیصد حوالے درج ہوں، معلومات مستند ہوں، متن آسان فہم اور نکات عملی ہوں خصوصاً آج کے دور میں عمل کرنے کے لیے، اور طوالت بتول کے تین صفحات سے کم اور چار صفحات سے زیادہ نہ ہو۔ یہ تو بنیادی شرائط ہیں۔ ترجیحی شرائط یہ ہیں کہ ایسی احادیث کو موضوع بنایا جائے جو اہم ہیں مگر جن پر ہمارے عمومی ماحول میں بہت کم توجہ کی گئی ہے، یا پاپولر موضوعات کے ایسے پہلو زیرِ غور لائے گئے ہوں جو ہمارے ہاں کم جانے اور سمجھے گئے ہیں۔ اس کے لیے میں اپنے ان قارئین کو خصوصاً تحریک دینا چاہوں گی جن کی اعلیٰ تعلیم اسلامیات یا تقابل ادیان کے مضامین میں ہے۔ یہ بات نہ بھولیں کہ بتول آپ کا اپنا رسالہ ہے، آپ کی علمی اور تحریری صلاحیتوں کا پہلا حقدار ہے اور اس کا معیار آپ کی تحریروں کے معیار پر منحصر ہے۔

دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

صائمہ اسما

تلاوت کے آداب

قرآن کے ساتھ طویل رفاقت آپ کی محبوب ترین آرزوؤں اور مشاغل میں سے ایک ہوجانا چاہئے۔ اس کی تلاوت جتنی کثرت سے اور جتنی زیادہ سے زیادہ آپ کرسکتے ہیں، کریں۔ جتنا زیادہ وقت آپ کو مل سکے، خصوصاً رات کے اوقات، قرآن کے ساتھ بسر کیجئے۔ رسول اللہؐ اور آپؐ کے رفقا کی روحانی تربیت اسی طرح اللہ کی راہ میں کی گئی تاکہ قرآن جو بھاری بوجھ اور ذمہ داری ان پر ڈال رہا ہے، اس کے لئے وہ تیار ہوسکیں۔

کتنی مرتبہ پڑھیں؟

آپ کو روزانہ کچھ نہ کچھ قرآن ضرور پڑھنا چاہئے۔ اپنی زندگی کے کسی دن کو مکمل نہ سمجھئے جب تک کہ اس کا کچھ نہ کچھ حصہ آپ نے قرآن کے ساتھ صرف نہ کرلیا ہو۔ کبھی کبھار طویل حصے پڑھنے کے مقابلے میں یہ بہتر ہے کہ پابندی سے روزانہ مختصر حصہ ہی پڑھا جائے۔

اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ اللہ کو وہ کام پسند ہیں جو باقاعدگی سے کئے جائیں، خواہ تھوڑے ہوں (بخاری، مسلم)۔ آپؐ نے خاص طور پر خبردار کیا کہ قرآن باقاعدگی سے پڑھنا چاہیے، ورنہ جو کچھ حاصل کیا ہے وہ آسانی سے ضائع ہوجائے گا۔ قرآن کے ساتھی کی مثال اس سے بندھے اونٹ کی سی ہے، انسان کے پاس وہ اس وقت تک ہے جب تک وہ اس کی نگہداشت کرتا ہے اور اگر کھلا چھوڑ دے تو وہ بھاگ جاتا ہے (بخاری، مسلم)۔

کتنا پڑھا جائے؟

اس کا کوئی متعین جواب نہیں۔ یہ ہر فرد کے لئے مختلف ہوگا، مختلف حالات میں مختلف ہوگا۔ رہنما اصول وہ ہونا چاہئے جو اللہ تعالیٰ نے، تمام بشری عذرات کو سامنے رکھ کر خود بیان کیا ہے: پڑھو، جو کچھ تم آسانی سے پڑھ سکو (المزمل ۷۳:۲۰)

اس حوالے سے صحابہ اور تابعین کے عمل میں خاصا فرق تھا۔ کچھ لوگ پورا قرآن دو ماہ میں ختم کرلیا کرتے تھے، کچھ ایک مہینے میں، کچھ دس دن میں، کچھ ایک ہفتے میں، کچھ ایک دن میں..... آپ درج ذیل حدیث کو معیار کے طور پر سامنے رکھئے: جو تین دن سے کم میں قرآن ختم کرتا ہے، وہ اسے سمجھتا نہیں (ابوداؤد، ترمذی)۔

ایک دفعہ حضرت ابن عمرؓ نے ..... جب رسول اللہؐ نے ان سے ایک ماہ میں قرآن ختم کرنے کے لئے فرمایا..... کم وقت میں ختم کرنے پر اصرار کیا تو اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: سات دن میں پڑھو اور اس سے کم نہ کرو۔

قرآن کی سات منزلوں میں اور ۳۰ پاروں میں تقسیم سے بھی کچھ اشارہ ملتا ہے کہ کیا مناسب ہے۔ اس سلسلے میں امام نوویؒ کی ہدایت بہت مناسب ہے۔ وہ شخص جو غور و خوض سے گہرے معانی تک پہنچ سکتا ہے، اسے کم پڑھنا چاہئے۔ اسی طرح جن کو تعلیم و تدریس، معاملات حکومت، یا اسلام کے تفویض کردہ اہم فرائض انجام دینے ہیں، وہ بھی کم پڑھ سکتے ہیں (کتاب الاذکار)۔

مطالعے کی مقدار کا بڑی حد تک انحصار مطالعے کے مقصد پر ہوگا۔ اگر آپ قرآن کے ساتھ وقت صرف کرنا چاہئے ہیں، یا صرف ایک طائرانہ نظر ڈالنا چاہتے ہیں تو آپ تیز رفتاری سے پڑھ سکتے ہیں اور اس لئے زیادہ پڑھ سکتے ہیں۔ اگر آپ غور و فکر اور تدبر کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو سست رفتاری سے پڑھنا ہوگا، اس لئے کم پڑھیں گے۔ امام غزالیؒ جب کسی کا یہ قول نقل کرتے ہیں تو ان کا مطلب یہی ہوتا ہے: ''میں بعض اوقات ہر جمعے کو بعض اوقات ہر ہفتے، بعض اوقات ہر سال مکمل قرآن

پڑھتا ہوں لیکن دوسری طرف گزشتہ برس سے (ایک خاص انداز سے) مطالعہ کر رہا ہوں لیکن ابھی تک مکمل نہیں کر سکا ہوں (احیاء العلوم)۔

ہمارے موجودہ حالات میں، میرا خیال ہے کہ ہم میں سے بیش تر کو ہر ۸ ماہ میں ایک دفعہ قرآن ختم کرنے کا ہدف ضرور رکھنا چاہئے۔ اس میں روزانہ ۵ سے ۱۵ منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوں گے، اس کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ آپ معنی براہ راست سمجھ رہے ہیں یا ترجمے کی مدد لے رہے ہیں۔ مگر زندگی میں کبھی کبھار سات دن میں ایک مکمل تلاوت کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یا ایک ماہ میں، خصوصاً ماہ رمضان میں..... کچھ وقت آہستہ آہستہ پڑھنے کے لئے مختص کرنا چاہیے تا کہ غور و فکر اور تدبر ہو سکے..... ضروری نہیں کہ ایسا روزانہ ہو۔

کب پڑھا جائے؟

دن اور رات کا کوئی بھی حصہ تلاوت قرآن کے لئے نامناسب نہیں ہے۔ نہ بیٹھنے کا کوئی ایسا انداز ہے جس میں آپ تلاوت نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کیا کرو (الدھر ۷۶:۲۵)۔

جو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ (آل عمران ۳:۱۹۱)

اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کا بہترین طریقہ یقیناً تلاوت قرآن ہے۔ امام نوویؒ کہتے ہیں کہ صحابہ اور تابعین دن اور رات کے ہر حصے میں قرآن پڑھا کرتے تھے، خواہ وہ ایک جگہ مقیم ہوں، یا سفر کر رہے ہوں۔ تاہم کچھ اوقات زیادہ پسندیدہ ہیں اس لئے کہ قرآن اور رسول اکرمؐ نے انہیں تجویز کیا ہے۔ یہ لمحات زیادہ اجر کا باعث اور زیادہ مفید ہوتے ہیں۔ اسی طرح کچھ جسمانی حالتوں کی سفارش کی گئی ہے۔

تلاوت کے لئے بہترین وقت رات کا ہے اور بہترین جسمانی حالت نماز میں قیام کی ہے۔ یہ بات ابتدائی سورتوں میں سے ایک، المزمل کے ذریعے معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے مقامات پر بھی یہی بتایا گیا ہے۔ (آل عمران ۳:۱۱۳، بنی اسرائیل: ۱۷:۷۹، الزمر ۳۹:۹)۔

یہ کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ قرآن کے کچھ حصے حفظ کر لیں اور رات کے دوران کچھ دیر کے لئے جاگ کر انہیں دہرائیں۔ آپ سب کے لئے ہمیشہ ایسا کرنا کئی وجوہ سے ممکن نہ ہوگا۔ قرآن ان مجبوریوں کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی لئے آپ کو اجازت دیتا ہے: ''جتنا تم آسانی سے تلاوت کر سکتے ہو۔'' اس کا مطلب ہوا جتنا حصہ چاہیں، جس وقت چاہیں، جس طرح چاہیں لیٹ کر، بیٹھ کر، پڑھ لیں۔

رات کو نماز کے دوران قرآن کی تلاوت کے بے انتہا فوائد ہیں اور اس کی بڑی ضرورت ہے۔ اس کے لئے کچھ نہ کچھ وقت، کتنا ہی کم کیوں نہ ہو، چند منٹ سہی، آپ کو ضرور مختص کرنا چاہئیں تا کہ طے شدہ وقفوں کے ساتھ باقاعدگی سے تلاوت کریں، وقفے کتنے ہی طویل کیوں نہ ہوں، مثلاً ہفتہ وار، ماہانہ، مثالی صورت سے ممکنہ حد تک قریب رہنے کے لئے یہ اچھا ہوگا کہ آپ فجر اور عشاء کی نماز سے پہلے یا بعد، یا صبح طلوع آفتاب کے وقت یا رات بستر پر جانے سے پہلے تلاوت قرآن کریں۔ قرآن نے صبح سویرے کی تلاوت کے لئے خاص طور پر کہا ہے (بنی اسرائیل ۱۷:۷۸)۔

تکیے سے ٹیک لگا کر، بستر یا صوفے پر لیٹ کر قرآن پڑھنا پسندیدہ نہیں، مگر منع بھی نہیں۔ کسی خاص وجہ کے بغیر آپ ہرگز ایسا نہ کریں نہ اسے اپنی عادت بنائیں۔ تاہم اگر کوئی شخص اس لئے قرآن پڑھنے سے بالکل ہی محروم رہے کہ وہ ایک خاص طرح بیٹھنے کے لئے تیار نہیں ہے، تو یقیناً وہ ایک بہت قیمتی شے کا نقصان کر رہا ہے۔

صحت کے ساتھ تلاوت

آپ کو قرآن کو صحیح صحیح پڑھنا چاہئے۔ تجوید کا فن نہ بھی سیکھ سکیں تب بھی اعراب اور حروف کی ادائیگی صحت کے ساتھ ہونا چاہئے۔ عربی ایسی زبان ہے کہ پڑھتے ہوئے اعراب کی معمولی غلطی سے بعض اوقات معنی میں بڑی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات معنی بالکل مسخ ہو جاتے ہیں اور ایسا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے جو کفر کے مصداق ہوتا ہے۔

ایک ماہ تک ایک گھنٹہ روز کا مسلسل مطالعہ کسی پڑھے لکھے شخص کو اس کے لئے کم سے کم ضروری ابتدائی مہارت حاصل کرنے کے لئے کافی ہونا چاہیے۔

کوئی شخص بھی صحت کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرنے کی پرخلوص

کوشش سے بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن جب آپ سیکھ رہے ہوں، تو یہ بات کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے، تلاوت ترک کرنے کی وجہ نہیں ہونا چاہیے۔ ایک غیر عرب صحت سے پڑھنے کے فن کا ماہر نہیں ہوسکتا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کو سیکھنے کا موقع نہ ملے۔ رسول اللہ گو ان مشکلات کا احساس تھا۔ اسی لیے آپؐ نے حضرت جبرئیلؑ سے کہا: اے جبرئیلؑ، میں ان پڑھ لوگوں میں بھیجا گیا ہوں۔ ان میں بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں، لڑکے اور لڑکیاں اور وہ لوگ جنہوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی (ترمذی)۔

اس حوالے سے رسول اللہؐ کے اطمینان دلانے والے یہ الفاظ آپ یاد ضرور رکھیں، لیکن کسی بھی طرح انہیں سیکھنے کی کوششوں کو ترک کرنے یا کم کرنے کا بہانہ نہ بنائیں:

جو شخص قرآن پڑھنے میں مہارت رکھتا ہے (وہ ان) معزز و مکرم فرشتوں کے ساتھ ہے جو وحی الٰہی لے کر اترتے ہیں۔ جو پڑھنے میں غلطی کرتا ہے اور درست پڑھنے میں دقت محسوس کرتا ہے، اسے دہرا اجر ہوگا (پڑھنے کا، اور کوشش کرنے کا (بخاری و مسلم)۔

حسنِ قرأت

قرآن کو صحت کے ساتھ پڑھنے کے بعد کا مرحلہ یہ ہے کہ قرأت کا فن سیکھا جائے تاکہ اسے حسن کے ساتھ پڑھا جائے۔ خوش گوار، مترنم انداز اور میٹھی آواز میں۔ متعدد احادیث اس طرف اشارہ کرتی ہیں:

قرآن کو اپنی آوازوں سے زینت دو (ابوداؤد)۔

اللہ تعالیٰ کسی بات کو اتنی اچھی طرح نہیں سنتا، جتنی کسی نبی کے بلند آواز سے قرآن تلاوت کرنے کو (بخاری، مسلم)۔

جو قرآن مترنم آواز سے نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں (بخاری)۔

مگر یاد رکھیے کہ اصل حسن وہ ہے جو دل میں خشیت الٰہی سے آواز میں آتا ہے۔ اس شخص کی تلاوت و آواز سب سے زیادہ خوب صورت ہے کہ جب آپ اسے تلاوت کرتے ہوئے سنیں تو خیال کریں کہ اسے اللہ کا خوف ہے۔

توجہ سے سننا

جب بھی قرآن پڑھا جائے، متوجہ ہو جایئے اور خاموش ہو کر سنیے۔

قرآن نے خود اس کا حکم دیا ہے:

جب قرآن تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے (الاعراف ۷:۲۰۴)۔

ظاہر بات ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آپ سے بات کر رہا ہے تو آپ کو خاموش ہونا چاہیے۔ لیکن عربی کا لفظ ''سمع'' صرف سننے کے مشینی فعل کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ توجہ اور قبول کرنے کی ایک خاص کیفیت کا اظہار بھی کرتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی کام، جو اس ہدایت کے خلاف ہو، نہ کیا جائے: جس وقت قرآن پڑھا جا رہا ہو، کوئی اور بات کرنا، دوسرے کام کرتے ہوئے قرآن کے کیسٹ بطور پس منظر موسیقی کے چلانا، سرگوشیاں کرنا جب کہ قرآن پڑھا جا رہا ہو، تقاریب کا آغاز تلاوت قرآن سے کرنا جب کہ کوئی اس طرف متوجہ نہ ہو اور کوئی سن نہ رہا ہو۔

بعض فقہا تو اس وقت نماز پڑھنے سے بھی منع کرتے ہیں، جب آپ کے نزدیک ہی قرآن کی تلاوت بلند آواز سے کی جا رہی ہو۔ اس قاعدے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جو شخص قرآن کی تلاوت کر رہا ہو وہ اپنی آواز کم کرے یا خاموشی سے پڑھے اگر اس کی بلند آواز، اس کے آس پاس افراد پر ایسے تقاضے عائد کرے جنہیں پورا کرنا ان کے لئے مشکل یا ناممکن ہو۔ اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کا یہ بھی ایک پہلو ہے۔ مزید یہ کہ اگر لوگوں کو خواہش نہ ہو تو انہیں قرآن سننے پر مجبور نہ کیا جائے۔ ان لوگوں سے جو قرآن صحت کے ساتھ اور حسن قرأت کے ساتھ تلاوت کرتے ہیں خاص طور پر فرمائش کر کے قرآن تلاوت کروانا، اور سننا بڑی اچھی بات ہے۔ نبی کریمؐ اپنے صحابہؓ سے فرمائش کر کے قرآن سنتے تھے۔ آپ کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ نبی اکرمؐ نے اس بارے میں کیا فرمایا ہے:

جو قرآن کی ایک آیت بھی سنتا ہے، اسے دہرا اجر دیا جائے گا اور جو تلاوت کرتا ہے، یہ قیامت کے روز اس کے لئے نور ہوگا (احمد)۔

ختم قرآن

جب کبھی آپ مکمل قرآن کی تلاوت ختم کریں اور یہ کتنا ہی بار بار کیوں نہ ہو، تو یہ وقت خوشی منانے اور نماز پڑھنے کا ہے۔ امام نوویؒ اس بارے میں کچھ آداب بیان کرتے ہیں جن کی بنیاد وہ معمولات ہیں جو صحابہ و تابعین اختیار کرتے تھے۔ یہ لازمی نہیں ہیں، لیکن مطلوب ہیں۔ انہیں جتنی کثرت سے آپ اختیار کر سکتے ہوں، اختیار کریں۔

اول: بہتر ہے کہ جمعہ کی رات کو تلاوت کا آغاز کیا جائے اور جمعرات کی رات کو ختم کیا جائے۔ کچھ لوگ پیر کی صبح آغاز کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ بعض دوسرے، دوسرے اوقات کا انتخاب کرتے تھے۔ اس طرح کوئی بھی وقت ایسا نہیں جو برکت سے خالی ہو اور قیامت کے روز گواہی نہ دے۔

دوئم: آخری حصہ، نماز کے اندر پڑھیے، خصوصاً اگر ختم تنہائی میں کر رہے ہیں۔

سوئم: ختم کے وقت دوسرے لوگوں کو جمع کریں اور ساتھ ملا کر عاجزی سے دعائیں کریں۔ حضرت انسؓ بن مالک کا معمول تھا کہ جب قرآن ختم کرتے تو اپنے اہل خانہ کو جمع کرتے اور دعائیں کرتے (ابوداؤد)۔

حاکم ابن عتیبہ سے روایت ہے: ایک دفعہ مجھے مجاہد اور عبادہ ابن ابی لبابہ نے بلایا اور مجھ سے کہا: ''ہم نے تمہیں اس لئے دعوت دی ہے کہ ہم قرآن ختم کرنے والے ہیں اور ختم کے وقت کی گئی دعائیں قبول کی جاتی ہیں۔'' ایک دوسری روایت میں انہوں نے کہا: ''قرآن ختم ہونے کے وقت اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔''

چہارم: جس دن آپ قرآن ختم کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں، روزہ رکھیں۔

پنجم: آخری سورہ پڑھتے ہی دوسری تلاوت قرآن کا آغاز کر دیں یعنی سورہ الناس کے بعد الفاتحہ اور البقرہ کی ابتدائی آیات۔

ایک مفہوم میں اس سے حضرت انسؓ بن مالک کی اس حدیث کی تعمیل ہو جائے گی کہ افضل عمل یہ ہے کہ قیام کیا جائے اور رخصت ہوا جائے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے تو آپ نے فرمایا: ''قرآن ختم کرنا اور پھر شروع کرنا۔''

ششم: تلاوتِ قرآن کے بعد دعائیں کریں اور عاجزی سے روئیں اور گڑگڑائیں۔ اس وقت دعا قبول ہوتی ہے اور اللہ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے، یہ بات بہت زور دے کر بتائی گئی ہے۔ جب کوئی قرآن کی تلاوت کر کے دعا کرتا ہے تو ۴۰ ہزار فرشتے آمین کہتے ہیں۔

دعائیں کیجئے..... خدا سے ڈرتے ہوئے، امیدوں کے ساتھ، نرمی اور اصرار کیساتھ، عاجزی کے ساتھ..... اپنے لیے دعا کیجئے، ہر ضرورت کے لئے اور ہر ایک کے لئے، خصوصاً امت کے اجتماعی مسائل کے لیے، اس کے حکمرانوں کی بہتری کے لئے، دشمنوں سے اس کی حفاظت کے لئے، صلاح وتقویٰ کے امور یا باہمی تعاون اور اتحاد کے لئے راہ حق پر ان کی استقامت کے لئے۔

حفظِ قرآن

قرآن کا جتنا حصہ حفظ کر سکتے ہیں، ضرور کیجئے۔ قرآن اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ خود تقاضا کرتا ہے کہ یاد رکھا جائے اور حفظ کیا جائے۔

لفظ حفظ، اب یاد کرنے کے محدود معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جب کہ فہم وعمل بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ دوسری زبانوں میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو اس کے مفہوم کو ٹھیک ٹھیک ادا کرے۔

اپنے اندر قرآن کے نفوذ کیلئے حفظ ایک ضروری ذریعہ ہے۔ یہ کوئی مشینی رسمی طریقہ نہیں ہے، بلکہ ایک اعلیٰ روحانی عمل ہے۔ حفظ ہی کے ذریعے آپ قرآن کو نمازوں میں پڑھ سکتے ہیں اور جب آپ ان الفاظ کے ذریعے اپنے سے ہم کلام ہونے والے کے سامنے کھڑے ہوں تو ان کے معانی پر غور کر سکتے ہیں۔ مگر اس سے قطع نظر، اس طرح قرآن آپ کی زبان پر جاری رہتا ہے، آپکے قلب میں جاگزیں رہتا ہے اور آپ کے ذہن نشین رہتا ہے..... اور آپ کا ہر وقت کا مستقل ساتھی بن جاتا ہے۔ آپ جوں جوں زیادہ حفظ کریں گے آپ محسوس کریں گے کہ اس کی تلاوت میں آپ کی اندرونی ذات کی شرکت ہوتی جاتی ہے اور آپ کے ذہن کے لئے اس کا مطالعہ اور مفہوم کو سمجھنا آسان تر ہوتا جاتا ہے۔ نبی کریمؐ نے اس پر مختلف طرح زور دیا ہے:

قرآن حفظ کرو، اللہ تعالیٰ اس دل کو عذاب نہیں دے گا جس میں قرآن ہوگا (شرح السنہ) جس شخص کے اندر قرآن کا کوئی حصہ نہ ہو وہ ایک اجڑے ہوئے مکان کی طرح ہے (ترمذی)۔

قرآن کے لئے آپ نے جو وقت مختص کیا ہے، اس کا کچھ حصہ حفظ میں لگایئے، اسے منظّم انداز سے کیجئے۔ اپنے اہداف کو مدت کے ساتھ مربوط کیجئے۔ آپ کی فہرست میں وہ سب حصے شامل ہونے چاہئیں جن کی نبی اکرم ﷺ عموماً نمازوں میں یا دن اور رات کے خاص اوقات میں تلاوت کرتے تھے، یا جن کی تلاوت کی اپنے صحابہؓ کو ہدایت کرتے تھے، یا جن کے فضائل کا تذکرہ کرتے تھے۔ جب آپ قرآن باقاعدگی سے پڑھیں گے، تو کچھ حصوں میں لامحالہ کشش محسوس کریں گے اور آپ کو انہیں بھی حفظ کرنا چاہیے۔

☆.....☆.....☆

حلاوتِ ایمان کا حصول

قالَ رسول اللہؐ ذاق طعم الایمان من رضی باللہ رباً وبالاسلام دیناً وبمحمدٍ رسولاً (بخاری و مسلم) ہوتا ہے چاہے وہ خیر ہو چاہے شر۔''

حضورؐ نے فرمایا کہ ''ایمان کا مزہ چکھا اس شخص نے جو اللہ کو اپنا رب ماننے اور اسلام کو اپنا دین ماننے اور محمدؐ کو اپنا رسول تسلیم کرنے پر راضی ہو گیا۔''

بات ہو رہی ہے ایمان کا مزہ چکھنے کی۔ ہم تو عادی ہیں قسم قسم کے کھانوں کے مزے چکھنے کے، یہ ایمان کا مزہ کیا ہے؟ اور جب کھانے کی چیزوں کی بات ہو تو ہم ان کو دیکھ کر، ہاتھ لگا کر اور چکھ کر یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سموسہ ہے اور یہ پکوڑہ ہے اور ان کا ذائقہ اس طرح کا ہے۔ تو آیئے پہلے یہ سمجھیں کہ ایمان کیا ہے اور پھر ہم اسکے مزے کو چکھنے کی تدبیر جانیں گے۔

ایمان کے اصل معنی ہیں کسی پر اعتماد کرنا اور اس اعتماد کی وجہ سے اسکی بات کو سچ کہنا اور ماننا۔ ایمان ایک معاہدہ ہے اللہ تعالیٰ سے اس معاہدے کی بنیاد شعور و دلائل پر ہوتی ہے اور یہ کسی دباؤ کے بغیر آزادیِ اختیار کے ساتھ استوار کیا جاتا ہے۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث ''حدیث جبریل'' کے نام سے مشہور ہے اور یہ ایک بہت لمبی حدیث ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت جبرائیلؑ ایک دن حضورؐ کی خدمت میں انسانی شکل میں آئے اور اسلام، ایمان، احسان اور قیامت کے بارے میں سوالات کئے اور آپؐ نے ان سب کے جوابات دیئے۔ حضرت جبرائیلؑ نے جب آپؐ سے پوچھا ''بتایئے ایمان کیا ہے؟'' آپؐ نے فرمایا ''ایمان یہ ہے کہ تم اللہ کو، اسکے فرشتوں کو، اسکی بھیجی ہوئی کتابوں کو، اسکے رسولوں کو اور آخرت کو حق جانو اور حق مانو اور اس بات کو بھی مانو کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے خدا کی طرف

امید ہے کہ اس حدیث کے ذریعے ہماری سمجھ میں یہ بات آ گئی ہو گی کہ ایمان شعوری طور پر ان تمام پہلوؤں پر اعتماد و یقین کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاہدہ ہے۔ آیئے اب اس معاہدے کے 3 اہم تقاضوں پر باری باری غور کریں۔

سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کو اپنا رب ماننے ''**رضیَ باللہِ رباً**'' پر راضی ہو جانا۔ اللہ کو ہمیشہ سے موجود مانا جائے اس کو کائنات کا پیدا کرنے والا اور کائنات کا تنہا انتظام کرنے والا مانا جائے۔ تسلیم کیا جائے کہ اس کا کوئی ساجھی اور شریک نہیں، نہ دنیا کو پیدا کرنے میں اور نہ دنیا کا انتظام چلانے میں اور مانا جائے کہ ہر طرح کے عیب اور ہر قسم کی کمی سے اس کی ذات پاک ہے اور وہ تمام اچھی صفتوں کا مالک اور تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔

سورۃ البقرہ (165) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں اس سے شدید محبت کرتے ہیں۔''

حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ ایک سفر میں میں آپؐ کے پیچھے سواری پر بیٹھا ہوا تھا۔ آپؐ نے فرمایا ''اے معاذ بن جبل...... میں نے کہا'' ''حضورؐ غلام حاضر ہے فرمائیں۔'' آپؐ نے سکوت اختیار کیا۔ پھر کچھ دور چلنے کے بعد پکارا ''اے معاذ بن جبلؓ'' میں نے وہی الفاظ دہرائے جو پہلی دفعہ کہے تھے۔ لیکن آپؐ نے کچھ نہ کہا۔ پھر کچھ دور چلنے کے بعد آپؐ نے پکارا ''معاذ بن جبلؓ'' میں نے عرض کیا ''حضورؐ! غلام حاضر ہے، ارشاد فرمائیں۔'' تب آپؐ نے فرمایا ''تم جانتے ہو اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ میں نے کہا۔ ''اللہ اور رسولؐ ہی بہتر علم رکھتے ہیں آپؐ

نے فرمایا اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اسی کی بندگی کریں اور بندگی میں کسی غیر کو ذرا بھی ساجھی نہ بنائیں۔'' پھر آپؐ نے تھوڑی دور چلنے کے بعد فرمایا'' اے معاذ! میں نے کہا'' ارشاد ہو، یہ غلام آپ کی بات غور سے سنے گا اور وفادارانہ آپ کی اطاعت کرے گا۔'' آپؐ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے؟ میں نے کہا اللہ اور رسولؐ ہی خوب واقف ہیں۔'' آپؐ نے فرمایا اللہ کی بندگی کرنے والے بندوں کا اللہ پر یہ حق ہے کہ وہ انہیں عذاب نہ دے۔'' (بخاری)

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ توحید جہنم کے عذاب سے بچنے کا ذریعہ ہے اور جو چیز خدا کے غضب سے بچانے والی ہو اور جنت کا حق دار بنانے والی ہو اس سے زیادہ قیمتی چیز بندہ کی نگاہ میں اور کیا ہوگی۔

معاہدے کا دوسرا پہلو ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اسلام کو اپنا دین مان کر اس فیصلے پر راضی ہو جائیں۔ سورہ البقرہ (208) میں بھی یہی حکم دیا گیا ہے کہ'' اے لوگو جو ایمان لائے ہو پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔'' یعنی زندگی کا کوئی لمحہ اسلام سے باہر نہ گزرے۔ اسی طرح جیسے ہم منزل تک پہنچنے کیلئے گاڑی میں پورے کے پورے داخل ہوتے ہیں Check کرتے ہیں کہ مسافر بھی پورے کے پورے داخل ہو جائیں۔ کسی کی ٹانگ، بازو، ہاتھ یا کپڑے بھی باہر نہ رہیں بلکہ سب کے سب پورے داخل ہو جائیں اور پھر گاڑی چلائی جاتی ہے۔ اسی طرح اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو کر منزل مراد تک پہنچنا ممکن ہے۔

دین اسلام خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے جو خدا کی محبت کو دلوں میں پختہ کرتا ہے۔ اسی پختہ یقین کا اقرار و اعلان کر کے انسان دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے، صاحب ایمان بنتا ہے۔ اس پختہ یقین اور ایمان کے اعلان کی توفیق جس خوش نصیب کو حاصل ہوتی ہے وہ تڑپتا ہے کہ وہ اپنے حلقۂ تعارف میں اس کلمہ کو عام کرے، اسکی حقیقت بندگان خدا کو سمجھائے، دلسوزی اور دلی تڑپ کے ساتھ اس کو لوگوں کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کرے اور لوگوں کو تیار کرے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کریں اور اس پر ایمان لائیں۔ صحابہ کرامؓ نے اس حقیقت کو دل سے تسلیم کر کے سخت ترین ماحول میں اس کا اعلان کیا اور کلمہ طیبہ کو عام کرنے اور بندگان خدا تک اس حقیقت کو پہنچانے کیلئے اپنی زندگی وقف کر دیں۔ وہ ایمان لانے کے بعد اپنے قبیلوں میں پہنچے تو اپنوں تک یہ دعوت پہنچانے کیلئے بے چین رہے ان کا مقصد اپنی زندگی کے معیار کو بہتر کرنا یا بینک بیلنس بڑھانا نہیں تھا بلکہ ان کا اصل ہدف اور اصل سرمایہ یہ تھا کہ وہ کتنے افراد کے دلوں میں اللہ کی یہ دعوت اتاریں اور کتنوں کو دائرہ اسلام میں داخل کریں۔

مغیرہ ابن شعبہؓ کا جب ایرانی سپہ سالار رستم اور دوسرے ایرانی کمانڈروں سے سامنا ہوا تو مغیرہ ابن شعبہؓ نے جچے تلے لفظوں میں ان کے سامنے اپنی حیثیت اور پیغام کا اظہار اس طرح فرمایا:

''ہم لوگ تاجر نہیں ہیں ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اپنی تجارت کے فروغ کیلئے نئی منڈیاں تلاش کریں۔ ہمارا نصب العین یہ دنیا نہیں ہے بلکہ ہمارا مقصود آخرت ہے، صرف آخرت۔ ہم دین حق کے علمبردار ہیں اور اس دین حق کی طرف لوگوں کو بلانا ہمارا نصب العین ہے۔''

اسلامی کمانڈر کی زبان سے یہ دل میں اتر جانے والے کلمات سن کر رستم گیا۔ اس کی فطرت نے پذیرائی کی اور بولا۔'' عرب کمانڈر! وہ دین حق کیا ہے جس کی طرف تم بندگان خدا کو بلاتے ہو ذرا اس کا تعارف تو کراؤ۔'' حضرت مغیرہؓ یہی تو چاہتے تھے۔ آپ نے اسلام کا بنیادی پیغام رستم کے سامنے پیش کر دیا۔

آج دشمنان اسلام ہم مسلمانوں سے ہماری پہچان کو چھیننا چاہتے ہیں۔ سورہ آل عمران (118) میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ'' ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلتا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ شدید تر ہے۔''

لیکن سورہ الصّف (8) میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان کو خود ہی جواب دیتے ہیں کہ'' یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے منہ کی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھا دیں اور اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے نور کا اتمام کر کے رہے گا خواہ یہ بات کافروں کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔''

لہٰذا ہم **اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا** پر اعتماد کے ساتھ زندگی گزاریں کیونکہ **ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ** سیدھا دین ہے۔ حضرت

جابرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نبیؐ کے پاس آئے اور کہا کہ ''ہم کو یہودیوں کی کچھ باتیں اچھی معلوم ہوئی ہیں تو آپؐ کی کیا رائے ہے؟ کیا ان میں سے کچھ ہم لکھ لیں؟''

آپؐ نے فرمایا ''کیا تم بھی گمراہی کے کھڈ میں گرنا چاہتے ہو جیسے یہود و نصاریٰ اپنی کتاب کو چھوڑ کر کھڈ میں گر گئے؟ میں تمہارے پاس وہ شریعت لایا ہوں جو سورج کی طرح روشن اور آئینہ کی طرح صاف ہے، اور اگر آج موسیٰؑ زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری پیروی کرنی پڑتی۔''

تو حل یہی ہوا کہ:

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جرأت کردار

آیئے اب اللہ سے کئے گئے معاہدے کے آخری تقاضے پر غور کریں۔ یہ تقاضا ہے محمدؐ کو اپنا رسول تسلیم کرنے پر راضی ہو جانا۔ بخاری و مسلم کی حدیث ہے کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ ''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کی نگاہ میں اسکے باپ اسکے بیٹے اور سارے انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

کسی سے محبت کرنے اور اسے محبوب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی پسند کو اپنی پسند اور اسکی ناپسندیدگی کو اپنی ناپسندیدگی بنا دیا جائے۔ محبوب جس راستہ پر چلتا ہے اس راستہ کو اپنی زندگی کا راستہ بنا دیا جائے، اس کی قربت و صحبت اور اس کی خوشنودی کی خاطر ہر چیز قربان کی جائے اور قربان کرنے کیلئے تیار رہا جائے۔

حضورؐ کو محبوب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپؐ کے ایک ایک نقش قدم اور ایک ایک نشان راہ کو معلوم کریں اور اس پر چلنے کی بھرپور کوشش کریں۔ حضورؐ کے اس فرمان کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدمی مومن تب ہی بنتا ہے جب رسول اللہؐ اور ان کے لائے ہوئے دین کی محبت تمام محبتوں پر غالب آجائے۔ ہمیں اکثر ان حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ جب ہماری اولاد کی محبت ہمیں کسی اور راستے پر چلنے کے لئے مجبور کرتی ہے خاوند کی بہن، بھائیوں کی محبت کچھ اور رستے دکھاتی ہے اور حضورؐ کی محبت کسی دوسرے راستے پر چلنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ ایسے میں جس شخص نے اپنی ساری محبتوں اور ان کے تقاضوں کو ٹھکرا کر صرف حضورؐ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کو ترجیح دی تو سمجھ لیجئے کہ وہ پکا مومن ہے محبِّ رسولؐ ہے۔ ایسا ہی آدمی اسلام کو درکار ہے اور ایسے ہی آدمی دنیا کی تاریخ بناتے ہیں۔ صحابہؓ نبی کریمؐ سے گفتگو فرماتے تو کہتے ''یا رسول اللہؐ میرے ماں باپ آپ پر قربان، اور یہ صرف لفظی اظہار نہ تھا، انہوں نے عملاً ماں باپ قربان کر کے دکھائے۔ مال اولاد گھر بار ہر شے نبیؐ پر قربان کر دی اپنی جانوں کو حقیر جانا۔ اس محبت کی وجہ آپؐ کا وہ احسان عظیم ہے ہم پر جو اسلام کو لفظاً معناً اور عملاً ہم تک محفوظ طریقے سے پہنچانے کی خاطر آپؐ نے اپنی جان پر کھیل کر کیا۔ ہمیں جب بھی دین پر چلنا مشکل لگے تو سوچیں کہ:

آپؐ نے بھوک پیاس برداشت کی..... ہمارے لئے

آپؐ نے سر مبارک خاک ڈلوائی، راستوں میں کانٹے بچھائے جانے گوارا کر لئے۔ ہمارے لئے شعب ابی طالبؓ کی کٹھن آزمائش اور طائف کے سفر کے پتھر کھائے..... ہمارے لئے تاکہ یہ اسلام مجھ تک حرف بہ حرف پہنچ جائے۔ راتوں کو اٹھ کر اللّٰھُمَّ اُمَّتِیْ کہہ کر وہ ہمارے غم میں روتے رہے کہ کہیں ہم بھٹک نہ جائیں۔ آپؐ کا احسان ہم پر اتنا زیادہ ہے کہ آپؐ کی محبت ہم پر خود ہماری ذات ہمارے تمام رشتے ناتوں اور اموال سے بڑھ کر واجب ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

ساتھیو! ہم نے ایمان کے مطلب کو جانا۔ ایمان مضبوط بنانے والے 3 عناصر پر غور کیا۔ آیئے اب یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ہم وقتاً فوقتاً اپنے ایمان کا جائزہ کس طرح کر سکتے ہیں؟

چیک لسٹ

1۔ کیا ہماری نمازیں قضا ہو جاتی ہیں؟

2۔ کیا نماز ہم پڑھنے نماز میں سستی اور بے توجہی کا مظاہرہ کرتے ہیں؟

3۔ کیا قرآن کی تلاوت ہمارے دلوں پر اثر کرتی ہے؟

4۔کیا ہم گناہ کر کے ندامت محسوس کرتے ہیں؟

5۔کیا ہمیں مال اور شہرت حاصل کرنے کے خیالات گھیرے رکھتے ہیں؟

6۔کیا ہم دوسروں کی کامیابی پر حسد محسوس کرتے ہیں؟

7۔کیا ہماری محفلیں ہمیں اللہ کی یاد دلاتی ہیں؟

8۔کیا ہمارے میل جول کے لوگ دنیا کی زندگی میں مست ہیں؟

مندرجہ ذیل تدابیر ایمان کی حلاوت حاصل کرنے میں ہماری مددگار بن سکتی ہیں۔

1اللہ کے ناموں پر گہرائی سے غوروفکر2۔استغفار کی کثرت3۔نماز کی پابندی4۔دعا ''**یا مقلب المقلوب ثبت قلبی علی دینک**'' 5۔نفلی عبادت کی طرف رجحان6۔موت کی یاد7۔تقدیر پر پختہ اعتماد ہونا8۔اللہ کی تخلیق پر غوروفکر9۔تہجد10۔قرآن کی تلاوت۔

☆......☆......☆

شہادتِ امام حسینؓ

مقصدِ شہادت

ہر سال محرم میں کروڑوں مسلمان شیعہ بھی اور سنی بھی، امام حسینؓ کی شہادت پر اپنے رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں۔لیکن افسوس ہے کہ ان غم گساروں میں سے بہت ہی کم لوگ اس مقصد کی طرف توجہ کرتے ہیں، جس کے لئے امام نے نہ صرف اپنی جان عزیز قربان کی بلکہ اپنے کنبے کے بچوں تک کو کٹوا دیا۔

اب دیکھنا چاہئے کہ وہ مقصد کیا ہے؟ کیا امام تخت وتاج کیلئے اپنے کسی ذاتی استحقاق کا دعویٰ رکھتے تھے اور اس کے لئے انہوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی؟ کوئی شخص بھی جو امام حسینؓ کے گھرانے کی بلند اخلاقی سیرت کو جانتا ہے، یہ بدگمانی نہیں کرسکتا کہ یہ لوگ اپنی ذات کے لئے اقتدار حاصل کرنے کی خاطر مسلمانوں میں خوں ریزی کرسکتے تھے۔

تاریخ کے غائر مطالعہ سے جو چیز واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یزید کی ولی عہدی اور پھر اس کی تخت نشینی سے دراصل جس خرابی کی ابتدا ہورہی تھی، وہ اسلامی ریاست کے دستور اور اس کے مزاج اور اس کے مقصد کی تبدیلی تھی۔ اس تبدیلی کے پورے نتائج اگرچہ اس وقت سامنے نہ آئے تھے۔لیکن ایک صاحب نظر آدمی گاڑی کا رخ تبدیل ہوتے ہی یہ جان سکتا ہے کہ اب اس کا راستہ بدل رہا ہے، اور جس راہ پر یہ مڑ رہی ہے وہ آخر کار اسے کہاں لے جائے گا۔یہی رخ کی تبدیلی تھی جسے امام نے دیکھا اور گاڑی کو پھر سے صحیح پٹڑی پر ڈالنے کے لئے اپنی جان لڑا دینے کا فیصلہ کیا۔

نقطۂ انحراف

اس چیز کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ رسول اللہؐ اور خلفائے راشدینؓ کی سربراہی میں ریاست کو جو نظام چالیس سال تک چلتا رہا تھا اس کے دستور کی بنیادی خصوصیات کیا تھیں، اور یزید کی ولی عہدی سے مسلمانوں میں جس دوسرے نظام ریاست کا آغاز ہوا، اس کے اندر کیا خصوصیات دولت بنی امیہ و بنی عباس اور بعد کی بادشاہیوں میں ظاہر ہوئیں، اسی تقابل سے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ یہ گاڑی پہلے کس لائن پر چل رہی تھی، اور اس نقطہ انحراف پر پہنچ کر آگے وہ کس لائن پر چل پڑی اور اسی تقابل سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جس شخص نے رسول اللہؐ اور سیدہ فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی آغوش میں تربیت پائی تھی، اور جس نے صحابہ کی بہترین سوسائٹی میں بچپن سے بڑھاپے تک کی منزلیں طے کی تھیں، وہ کیوں اس نقطہ انحراف کے سامنے آتے ہی گاڑی کو اس نئی لائن پر جانے سے روکنے کے لئے کھڑا ہوگیا اور کیوں اس نے اس بات کی بھی پروانہ کی کہ اس زوردار گاڑی کا رخ موڑنے کے لئے اس کے آگے کھڑے ہو جانے کا کیا نتیجہ ہوسکتا ہے۔

انسانی بادشاہی کا آغاز

اسلامی ریاست کی اولین خصوصیت یہ تھی کہ اس میں صرف زبان ہی سے یہ نہیں کہا جاتا تھا بلکہ سچے دل سے یہ مانا بھی جاتا تھا، اور عملی رویہ سے اس عقیدہ و یقین کا پورا ثبوت بھی دیا جاتا تھا۔کہ ملک خدا کا ہے، باشندے خدا کی رعیت ہیں اور حکومت اس رعیت کے معاملے میں خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔حکومت اس رعیت کی مالک نہیں اور رعیت اس کی غلام نہیں ہے۔حکمرانوں کا کام سب سے پہلے اپنی گردن میں خدا کی بندگی وغلامی کا قلادہ ڈالنا ہے، پھر یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ خدا کی رعیت پر اس کا قانون نافذ کریں۔لیکن یزید کی ولی عہدی سے جس انسانی بادشاہی کا مسلمانوں میں آغاز ہوا، اس میں خدا کی بادشاہی کا تصور صرف زبانی اعتراف تک محدود رہ گیا۔عملاً اس نے وہی نظریہ

اختیار کرلیا جو ہمیشہ سے ہر انسانی بادشاہی کا رہا ہے، یعنی ملک بادشاہ اور شاہی خاندان کا ہے اور وہ رعیت کی جان، مال، آبرو، ہر چیز کا مالک ہے۔ خدا کا قانون ان بادشاہتوں میں نافذ ہوا بھی تو صرف عوام پر ہوا، بادشاہ اور ان کے خاندان اور امرا اور حکام زیادہ تر اس سے مستثنیٰ ہی رہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تعطل

اسلامی ریاست کا مقصد خدا کی زمین میں ان نیکیوں کو قائم کرنا اور فروغ دینا ہے جو خدا کو محبوب ہیں۔ اور ان برائیوں کو دبانا اور مٹانا تھا جو خدا کو ناپسند ہیں۔ مگر انسانی بادشاہت کا راستہ اختیار کرنے کے بعد حکومت کا مقصد فتح ممالک اور تسخیر خلائق اور تحصیل باج وخراج اور عیش دنیا کے سوا کچھ نہ رہا۔ خدا کا کلمہ بلند کرنے کی خدمت بادشاہوں نے کم ہی کبھی انجام دی۔ ان کے ہاتھوں اور ان کے امرا اور حکام اور درباریوں کے ہاتھوں بھلائیاں کم اور برائیاں بہت زیادہ پھیلیں۔ بھلائیوں کے فروغ اور برائیوں کی روک تھام اور اشاعت دین اور علوم اسلامی کی تحقیق وتدوین کے لئے جن اللہ کے بندوں نے کام کیا انہیں حکومتوں سے مدد ملنی تو درکنار، اکثر وہ حکمرانوں کے غضب ہی میں گرفتار رہے اور اپنا کام وہ ان کی مزاحمتوں کے علی الرغم ہی کرتے رہے ان کی کوششوں کے برعکس حکومتوں اور ان کے حکام ومتوسلین کی زندگی اور پالیسیوں کے اثرات مسلم معاشرے کو پیہم اخلاقی زوال ہی کی طرف لے جاتے رہے۔ حد یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے مفاد کی خاطر اسلام کی اشاعت میں رکاوٹیں ڈالنے سے بھی دریغ نہ کیا، جس کی بدترین مثال بنوامیہ کی حکومت میں نومسلموں پر جزیہ لگانے کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

اسلامی ریاست کی روح تقویٰ اور خدا ترسی اور پرہیزگاری کی روح تھی جس کا سب سے بڑا مظہر خود ریاست کا سربراہ ہوتا تھا۔ حکومت کے عمال اور قاضی اور سپہ سالار، سب اس روح سے سرشار ہوتے تھے اور پھر اسی روح سے وہ پورے معاشرے کو سرشار کرتے تھے، لیکن بادشاہی کی راہ پر پڑتے ہی مسلمانوں کی حکومتوں اور ان کے حکمرانوں نے قیصر وکسریٰ کے سے رنگ ڈھنگ اور ٹھاٹھ باٹھ اختیار کر لئے۔ عدل کی جگہ ظلم وجور کا غلبہ ہوتا چلا گیا۔ پرہیزگاری کی جگہ فسق وفجور اور راگ رنگ اور عیش وعشرت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ حرام وحلال کی تمیز سے حکمرانوں کی سیرت وکردار خالی ہوتی چلی گئی۔ سیاست کا رشتہ اخلاق سے ٹوٹتا چلا گیا۔ خدا سے خود ڈرنے کے بجائے حاکم لوگ بندگان خدا کو اپنے آپ سے ڈرانے لگے۔ اور لوگوں کے ایمان وضمیر بیدار کرنے کے بجائے انہیں اپنی بخششوں کے لالچ سے خریدنے لگے۔

اسلامی دستور کے بنیادی اصول

یہ تو تھا روح ومزاج، مقصد اور نظریے کا تغیر۔ ایسا ہی تغیر اسلامی دستور کے بنیادی اصولوں میں بھی رونما ہوا۔ اس دستور کے سات اہم ترین اصول تھے جن میں سے ہر ایک کو بدل ڈالا گیا۔

1۔ آزادانہ انتخاب

دستور اسلامی کا سنگ بنیاد یہ تھا کہ حکومت لوگوں کی آزادانہ رضا مندی سے قائم ہو۔ کوئی شخص اپنی کوشش سے اقتدار حاصل نہ کرے بلکہ لوگ اپنے مشورے سے بہتر آدمی چن کر اقتدار اس کے سپرد کر دیں۔ بیعت اقتدار کا نتیجہ نہ ہو بلکہ اس کا سبب ہو۔ بیعت حاصل ہونے میں آدمی کسی کوشش یا سازش کا دخل نہ ہو۔ لوگ بیعت حاصل کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں پوری طرح آزاد ہوں۔ جب تک کسی شخص کو بیعت حاصل نہ ہو وہ برسر اقتدار نہ آئے اور جب لوگوں کا اعتماد اس پر سے اٹھ جائے تو وہ اقتدار سے چمٹا نہ رہے۔ خلفائے راشدین میں سے ہر ایک اسی قاعدے کے مطابق برسر اقتدار آیا تھا۔ امیر معاویہؓ کے معاملے میں پوزیشن مشتبہ ہو گئی۔ اسی لئے صحابیؓ ہونے کے باوجود ان کا شمار خلفائے راشدینؓ میں نہیں کیا گیا۔ لیکن آخر کار یزید کی ولی عہدی وہ انقلابی کارروائی ثابت ہوئی جس نے اس قاعدے کو الٹ کر رکھ دیا۔ اس سے خاندانوں کی موروثی بادشاہتوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس کے بعد سے آج تک پھر مسلمانوں کو انتخابی خلافت کی طرح پلٹنا نصیب نہ ہو سکا۔ اب لوگ مسلمانوں کے آزادانہ اور کھلے مشورے سے نہیں بلکہ طاقت سے برسر اقتدار آنے لگے۔ اب بیعت سے اقتدار حاصل ہونے کی بجائے اقتدار سے بیعت حاصل کی جانے لگی۔ اب بیعت کرنے یا نہ کرنے میں لوگ آزاد نہ رہے اور بیعت کا حاصل ہونا اقتدار پر قائم

رہنے کے لئے شرط نہ رہا۔لوگوں کی اول تو یہ مجال نہ تھی کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار تھا اس کی بیعت نہ کرتے ۔لیکن اگر وہ بیعت نہ بھی کرتے تو جس کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا تھا، وہ ہٹنے والا نہ تھا۔اسی جبری بیعت کو کالعدم قرار دینے کا قصور جب منصور عباسی کے زمانے میں امام مالکؒ سے سرزد ہوا تو ان کی پیٹھ پر کوڑے برسائے گئے اور ان کے ہاتھ شانوں سے اکھڑوا دیئے گئے۔

2۔شورائی نظام

دوسرا اہم ترین قاعدہ اس دستور کا یہ تھا کہ حکومت مشورے سے کی جائے اور مشورہ ان لوگوں سے کیا جائے جن کے علم ،تقویٰ اور اصابتِ رائے پر عام لوگوں کو اعتماد ہو۔خلفائے راشدینؓ کے عہد میں جو لوگ شوریٰ کے رکن بنائے گئے، اگرچہ ان کو انتخاب عام کے ذریعے سے منتخب نہیں کرایا گیا تھا۔جدید زمانے کے تصور کے لحاظ سے وہ نامزد کردہ لوگ ہی تھے۔لیکن خلفا نے یہ دیکھ کر ان کو مشیر نہیں بنایا تھا کہ یہ ہماری ہاں میں ہاں ملانے ،اور ہمارے مفاد کی خدمت کرنے کے لئے موزوں ترین لوگ ہیں۔ بلکہ انہوں نے پورے خلوص اور بے غرضی کے ساتھ قوم کے بہترین عناصر کو چنا تھا جن سے وہ حق گوئی کے سوا کسی چیز کی توقع نہ رکھتے تھے،جن سے یہ امید تھی کہ وہ ہر معاملے میں اپنے علم وضمیر کے مطابق بالکل صحیح ایمان دارانہ رائے دیں گے،جن سے کوئی شخص بھی یہ اندیشہ نہ رکھتا تھا کہ وہ حکومت کو کسی غلط راہ پر جانے دیں گے۔اگر اس وقت ملک میں آج کل کے طریقے کے مطابق انتخابات بھی ہوتے تو عام مسلمان انہی لوگوں کو اپنے اعتماد کا مستحق قرار دیتے۔ لیکن شاہی دور کا آغاز ہوتے ہی شوریٰ کا یہ طریقہ بدل گیا۔اب بادشاہ استبداد اور مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرنے لگے۔اب شاہ زادے اور خوشامدی اہل دربار، اور صوبوں کے گورنر اور فوجوں کے سپہ سالاران کی کونسل کے ممبر تھے۔اب وہ لوگ ان کے مشیر تھے جن کے معاملہ میں اگر قوم کی رائے لی جاتی تو اعتماد کے ایک ووٹ کے مقابلہ میں لعنت کے ہزار ووٹ آتے اور اس کے برعکس وہ حق شناس وحق گو اہل علم وتقویٰ جن پر قوم کو اعتماد تھا وہ بادشاہوں کی نگاہ میں کسی اعتماد کے مستحق نہ تھے، بلکہ الٹے معتوب یا کم از کم مشتبہ تھے۔

3۔اظہار رائے کی آزادی

اس دستور کا تیسرا اصول یہ تھا کہ لوگوں کو اظہار رائے کی پوری آزادی ہو۔امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو اسلام نے ہر مسلمان کا حق ہی نہیں بلکہ فرض قرار دیا تھا۔اسلامی معاشرے اور ریاست کے صحیح راستہ پر چلنے کا انحصار اس بات پر تھا کہ لوگوں کے ضمیر اور ان کی زبانیں آزاد ہوں، وہ ہر غلط کام پر بڑے سے بڑے آدمی کو ٹوک سکیں اور حق بات برملا کہہ سکیں۔خلافت راشدہ میں صرف یہی نہیں کہ لوگوں کا یہ حق پوری طرح محفوظ تھا، بلکہ خلفائے راشدینؓ اسے ان کا فرض سمجھتے تھے اور اس فرض کے ادا کرنے میں ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ان کی مجلس شوریٰ کے ممبروں ہی کو نہیں ،قوم کے ہر شخص کو بولنے اور ٹوکنے اور خود خلیفہ سے باز پرس کرنے کی مکمل آزادی تھی، جس کے استعمال پر لوگ ڈانٹ اور دھمکی سے نہیں بلکہ داد اور تعریف سے نوازے جاتے تھے۔ یہ آزادی ان کی طرف سے کوئی عطیہ اور بخشش نہ تھی جس کے لئے وہ قوم پر اپنا احسان جتاتے ، بلکہ یہ اسلام کا عطا کردہ ایک دستوری حق تھا جس کا احترام کرنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے،اور اسے بھلائی کے لئے استعمال کرنا ہر مسلمان خدا اور رسولؐ کا عائد کردہ ایک فریضہ تھا جس کی ادائیگی کے لئے معاشرے اور ریاست کی فضا کو ہر وقت ساز گار رکھنا ان کی نگاہ میں فرائض خلافت کا ایک اہم جز تھا۔لیکن بادشاہی دور کا آغاز ہوتے ہی ضمیروں پر قفل چڑھا دیئے گئے اور منہ بند کر دیئے گئے۔اب قاعدہ یہ ہو گیا ہے کہ زبان کھولو تو تعریف میں کھولو، ورنہ چپ رہو اور اگر تمہارا ضمیر ایسا زور آور ہے کہ حق گوئی سے تم باز نہیں رہ سکتے تو قید یا قتل کے لئے تیار ہو جاؤ۔یہ پالیسی رفتہ رفتہ مسلمانوں کو پست ہمت، بزدل اور مصلحت پرست بناتی چلی گئی۔خطرہ مول لے کر سچی بات کہنے والے ان کے اندر کم از کم ہوتے چلے گئے۔ خوشامد اور چاپلوسی کی قیمت مارکیٹ میں چڑھتی اور حق پرستی وراست بازی کی قیمت گرتی چلی گئی۔اعلیٰ قابلیت رکھنے والے ایمان دار اور آزاد خیال لوگ حکومت سے بے تعلق ہو گئے۔اوعوام کا حال یہ ہو گیا کہ کسی شاہی خاندان کی حکومت برقرار رکھنے کے لئے ان کے دلوں میں کوئی جذبہ باقی

نہ رہا۔ایک کو ہٹانے کے لئے جب دوسرا آیا تو انہوں نے مدافعت میں انگلی تک نہ ہلائی اور گرنے والا جب گرا تو انہوں نے ایک لات اور رسید کر کے اسے زیادہ گہرے گڑھے میں پھینکا۔حکومتیں جاتی اور آتی رہیں، مگر لوگوں نے تماشائی سے بڑھ کر اس آمد و رفت کے منظر سے کوئی دلچسپی نہ لی۔

4۔خدا اور خلق کے سامنے جواب دہی

چوتھا اصول، جو اس تیسرے اصول کے ساتھ لازمی تعلق رکھتا تھا، یہ تھا کہ خلیفہ اور اس کی حکومت خدا اور خلق دونوں کے سامنے جوابدہ ہے۔ جہاں تک خدا کے سامنے جواب دہی کا تعلق ہے اس کے شدید احساس سے خلفائے راشدینؓ پر دن کا چین اور رات کا آرام حرام ہو گیا تھا اور جہاں تک خلق کے سامنے جواب دہی کا تعلق ہے، وہ ہر وقت، ہر جگہ اپنے آپ کو عوام کے سامنے جواب دہ سمجھتے تھے۔ان کی حکومت کا یہ اصول نہ تھا کہ صرف مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) میں نوٹس دے کر ہی ان سے سوال کیا جا سکتا ہے، وہ ہر روز پانچ مرتبہ نماز کی جماعت میں اپنے عوام کا سامنا کرتے تھے۔وہ ہر ہفتے جمعہ کی جماعت میں عوام کے سامنے اپنی کہتے اور سنتے تھے۔وہ شب و روز بازاروں میں کسی باڈی گارڈ کے بغیر اور کسی ہٹو بچو کی آواز کے بغیر، عوام کے درمیان چلتے پھرتے تھے۔ان کے گورنمنٹ ہاؤس (یعنی ان کے کچے مکان) کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا تھا اور ہر ایک ان سے مل سکتا تھا۔ان سب مواقع پر ہر شخص ان سے سوال کر سکتا تھا اور جواب طلب کر سکتا تھا۔یہ محدود جواب دہی نہ تھی بلکہ کھلی اور ہمہ وقتی جواب دہی تھی۔ یہ نمائندوں کے واسطہ سے نہ تھی بلکہ پوری قوم کے سامنے براہ راست تھی۔وہ عوام کی مرضی سے برسر اقتدار آئے تھے اور عوام کی مرضی انہیں ہٹا کر دوسرا خلیفہ ہر وقت لا سکتی تھی۔اس لئے نہ تو انہیں عوام کا سامنا کرنے میں کوئی خطرہ محسوس ہوتا تھا اور نہ اقتدار سے محروم ہونا ان کی نگاہ میں کوئی خطرہ تھا کہ وہ اس سے بچنے کی کبھی فکر کرتے۔لیکن بادشاہی دور کے آتے ہی جوابدہ حکومت کا تصور ختم ہو گیا۔خدا کے سامنے جواب دہی کا خیال چاہے زبانوں پر رہ گیا ہو، مگر عمل میں اس کے آثار کم ہی نظر آتے ہیں۔رہی خلق کے سامنے جواب دہی، تو کون مائی کا لال تھا جو ان سے جواب طلب کر سکتا۔وہ اپنی قوم کے فاتح تھے۔مفتوحوں کے سامنے کون فاتح جواب دہ ہوتا ہے۔وہ طاقت سے برسر اقتدار آئے تھے اور ان کا نعرہ یہ تھا کہ جس میں طاقت ہو وہ ہم سے اقتدار چھین لے۔ ایسے لوگ عوام کا سامنا کب کیا کرتے ہیں اور عوام ان کے قریب کہاں پھٹک سکتے تھے۔وہ نماز بھی پڑھتے تھے تو تھوخیرے کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے محلوں کی محفوظ مسجدوں میں، یا باہر اپنے نہایت قابل اعتماد محافظوں کے جھرمٹ میں۔ان کی سواریاں نکلتی تھیں تو آگے اور پیچھے مسلح دستے ہوتے تھے اور راستے صاف کر دیئے جاتے تھے۔عوام کی اور ان کی مڈبھیڑ کسی جگہ ہوتی ہی نہ تھی۔

5۔بیت المال ایک امانت

پانچواں اصول اسلامی دستور کا یہ تھا کہ بیت المال خدا کا مال اور مسلمانوں کی امانت ہے، جس میں کوئی چیز حق کی راہ کے سوا کسی دوسری راہ سے آنی نہ چاہئے اور جس میں سے کوئی چیز حق کے سوا کسی دوسری راہ میں جانی نہ چاہیے۔خلیفہ کا حق اس مال میں اتنا ہی جتنا قرآن کی رو سے مال یتیم میں اس کے ولی کا ہوتا ہے **کہ مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ** اپنے ذاتی ذرائع آمدنی اپنی ضرورت بھر رکھتا ہو وہ اس مال سے تنخواہ لیتے ہوئے شرم کرے اور جو واقعی حاجت مند ہو وہ اتنی تنخواہ لے جسے ہر معقول آدمی مبنی بر انصاف مانے) خلیفہ اس کی ایک ایک پائی کے آمد و خرچ پر حساب دینے کا ذمہ دار ہے اور مسلمانوں کو اس سے حساب مانگنے کا پورا حق ہے۔خلفائے راشدین نے اس اصول کو بھی کمال درجہ دیانت اور حق شناسی کے ساتھ برت کر دکھایا۔ ان کے خزانے میں جو کچھ بھی آتا تھا ٹھیک ٹھیک اسلامی قانون کے مطابق آتا تھا اور اس میں سے جو کچھ خرچ ہوتا تھا بالکل جائز راستوں میں ہوتا تھا۔ان میں سے جو غنی تھا اس نے ایک حبہ اپنی ذات کے لئے تنخواہ کے طور پر وصول کیے بغیر مفت خدمت انجام دی، بلکہ اپنی گرہ سے قوم کے لئے خرچ کر کرچ کرنے میں بھی دریغ نہ کیا۔اور جو تنخواہ کے بغیر ہمہ وقتی خدمت گار نہ بن سکتے تھے، انہوں نے اپنی ضروریات زندگی کیلئے اتنی کم تنخواہ لی کہ ہر معقول آدمی اسے انصاف سے کم ہی مانے گا، زیادہ کہنے کی

جرأت ان کا دشمن بھی نہیں کرسکتا۔ پھر اس خزانے کی آمد وخرچ کا حساب ہر وقت ہر شخص مانگ سکتا تھا اور وہ ہر وقت ہر شخص کے سامنے حساب دینے کے لیے تیار تھے۔ ان سے ایک عام آدمی بھرے مجمع میں پوچھ سکتا تھا کہ خزانے میں یمن سے جو چادریں آئی ہیں ان کا طول وعرض تو اتنا نہ تھا کہ جناب کا یہ لمبا کرتہ بن سکے، یہ زائد کپڑا آپ کہاں سے لائے ہیں؟ مگر جب خلافت بادشاہی میں تبدیل ہوئی تو خزانہ خدا اور مسلمانوں کا نہیں بلکہ بادشاہ کا مال تھا۔ ہر جائز و ناجائز راستے سے اس میں دولت آتی تھی اور ہر جائز و ناجائز راستے میں بے غل وغش صرف ہوتی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے حساب کا سوال اٹھا سکے۔ سارا ملک ایک خوانِ یغما تھا جس پر ایک ہرکارے سے لے کر سربراہِ مملکت تک، حکومت کے سارے کل پرزے حسب توفیق ہاتھ مار رہے تھے، اور ذہنوں سے یہ تصور ہی نکل گیا تھا کہ اقتدار کوئی پروانۂ اباحت نہیں ہے جس کی بدولت یہ لوٹ ماران کے لئے حلال ہو اور پبلک کا مال کوئی شیر مادر نہیں ہے جسے وہ ہضم کرتے رہیں اور کسی کے سامنے انہیں اس کا حساب دینا نہ ہو۔

6۔ قانون کی حکومت

چھٹا اصول اس دستور کا یہ تھا کہ ملک میں قانون (یعنی خدا اور رسولؐ کے قانون) کی حکومت ہونی چاہئے۔ کسی کو قانون سے بالاتر نہ ہونا چاہیے۔ کسی کو قانون کی حدود سے باہر جا کر کام کرنے کا حق نہ ہونا چاہیے۔ ایک عام آدمی سے لے کر سربراہ مملکت تک سب کے لئے ایک ہی قانون ہونا چاہیے اور سب پر اسے بے لاگ طریقے سے نافذ ہونا چاہیے اور عدالتوں کو انصاف کرنے کے لئے ہر دباؤ سے بالکل آزاد ہونا چاہیے۔ خلفائے راشدینؓ نے اس اصول کی پیروی کا بھی بہترین نمونہ پیش کیا تھا۔ بادشاہوں سے بڑھ کر اقتدار رکھنے کے باوجود وہ قانون الٰہی کی بندشوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ نہ ان کی دوستی اور رشتہ داری قانون کی حد سے نکل کر کسی کو کچھ نفع پہنچا سکتی تھی، اور نہ ان کی ناراضی کسی کو قانون کے خلاف کوئی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ کوئی ان کے اپنے حق پر بھی دست درازی کرتا تو وہ ایک عام آدمی کی طرح عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے تھے، اور کسی کو ان کے خلاف شکایت ہوتی تو وہ استغاثہ کر کے انہیں عدالت میں کھینچ لا سکتا تھا۔ اسی طرح انہوں نے اپنی حکومت کے گورنروں اور سپہ سالاروں کو بھی قانون کی گرفت میں کس رکھا تھا کسی کی مجال نہ تھی کہ عدالت کے کام میں کسی قاضی پر اثر انداز ہونے کا خیال بھی کرتا۔ کسی کا یہ مرتبہ نہ تھا کہ قانون کی حد سے قدم باہر نکال کر مواخذہ سے بچ جاتا۔ لیکن خلافت سے بادشاہی کی طرف انتقال واقع ہوتے ہی اس قاعدے کے بھی چیتھڑے اڑ گئے۔ اب بادشاہ اور شاہزادے اور امرا اور حکام اور سپہ سالار ہی نہیں، شاہی محلات کے منہ چڑھے لونڈی غلام تک قانون سے بالاتر ہو گئے۔ لوگوں کی گردنیں اور پیٹھیں اور مال آبروئیں، سب ان کے لئے مباح ہو گئیں۔ انصاف کے دو معیار بن گئے۔ ایک کم زور کے لئے اور دوسرا طاقت ور کے لئے، مقدمات میں عدالتوں پر دباؤ ڈالے جانے لگے اور بے لاگ انصاف کرنے والے قاضیوں کی شامت آنے لگی۔ حتیٰ کہ خدا ترس فقہا نے عدالت کی کرسی پر بیٹھنے کی بجائے کوڑے کھانا اور قید ہو جانا زیادہ قابل ترجیح سمجھا تا کہ وہ ظلم و جور کے آلہ کار بن کر خدا کے عذاب کے مستحق نہ بنیں۔

7۔ حقوق اور مراتب کے لحاظ سے کامل مساوات

مسلمانوں میں حقوق اور مراتب کے لحاظ سے کامل مساوات، اسلامی دستور کا ساتواں اصول تھا جسے ابتدائی اسلامی ریاست میں پوری قوت کے ساتھ قائم کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے درمیان نسل، وطن، زبان وغیرہ کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ قبیلے اور خاندان اور حسب ونسب کے لحاظ سے کسی کو کسی پر فضیلت نہ تھی۔ خدا اور رسولؐ کے ماننے والے سب لوگوں کے حقوق یکساں تھے اور سب کی حیثیت برابر تھی۔ لیکن خلافت کی جگہ جب بادشاہی نظام آیا تو عصبیت کے شیاطین ہر گوشے سے سر اٹھانے لگے۔ شاہی خاندان اور ان کے حامی خانوادوں کا مرتبہ سب سے بلند و برتر ہو گیا۔ ان کے قبیلوں کو دوسرے قبیلوں پر ترجیحی حقوق حاصل ہو گئے۔ عربی اور عجمی کے تعصّبات جاگ اٹھے اور خود عربوں میں قبیلے اور قبیلے کے درمیان کشمکش پیدا ہو گئی۔ ملت اسلامیہ کو اس چیز نے جو نقصان پہنچایا اس پر تاریخ کے اوراق گواہ ہیں۔

امام حسینؓ کا مومنانہ کردار

یہ تھے وہ تغیرات جو اسلامی خلافت کو خاندانی بادشاہت میں تبدیل

کرنے سے رونما ہوئے ۔کوئی شخص اس تاریخی حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا کہ یزید کی ولی عہدی ان تغیرات کا نقطہ آغاز تھی ، اور اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ اس نقطے سے چل کر تھوڑی مدت کے اندر ہی بادشاہی نظام میں وہ سب خرابیاں نمایاں ہوگئیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں ۔جس وقت یہ انقلابی قدم اٹھایا گیا تھا ، اس وقت یہ خرابیاں اگرچہ بتمام وکمال سامنے نہ آئی تھیں ، مگر ہر صاحب بصیرت آدمی جان سکتا تھا کہ اس اقدام کے لازمی نتائج یہی کچھ ہیں اور اس سے ان اصلاحات پر پانی پھر جانے والا ہے جو اسلام نے سیاست وریاست کے نظام میں کی ہیں اسی لئے امام حسینؓ اس پر صبر نہ کرسکے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ جو بدتر سے بدتر نتائج بھی انہیں ایک مضبوط جمی جمائی صورت کے خلاف اٹھنے میں بھگتنا پڑیں ۔ان کا خطرہ مول لے کر بھی انہیں اس انقلاب کو روکنے کی کوشش کرنی چاہئے ۔اس کوشش کا جو انجام ہوا وہ سب کے سامنے ہے ۔مگر امام نے اس عظیم خطرے میں کود کر اور مردانہ وار اس کے نتائج کو انگیز کر کے جو بات ثابت کی وہ یہ تھی کہ اسلامی ریاست کی بنیادی خصوصیات امت مسلمہ کا وہ بیش قیمت سرمایہ ہیں جسے بچانے کے لئے ایک مومن اپنا سر بھی دے دے اور اپنے بال بچوں کو بھی کٹوا بیٹھے تو اس مقصد کے مقابلے میں یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے اور ان خصوصیات کے مقابلے میں وہ دوسرے تغیرات جنہیں اوپر نمبر وار گنایا گیا ہے ، دین اور ملت کے لئے وہ آفت عظمیٰ ہیں جسے رونے کے لئے ایک مومن کو اگر اپنا سب کچھ قربان کر دینا پڑے تو اس میں دریغ نہ کرنا چاہیے ۔کسی کا جی چاہے تو اسے حقارت کے ساتھ ایک سیاسی کام کہہ لے مگر حسینؓ ابن علیؓ کی نگاہ میں تو یہ سراسر ایک دینی کام تھا ، اسی لئے انہوں نے اس کام میں جان دینے کو شہادت سمجھ کر جان دی ۔

☆.....☆.....☆

ابھی ہم کچھ نہیں کہتے

ابھی ہم کچھ نہیں کہتے
کبھی وہ وقت آئے گا
در و دیوار بولیں گے
اگر زنداں میں ڈالا تو
پسِ دیوار بولیں گے
اگر لب سی دیئے تم نے
خموشی بول اٹھے گی
اگر خنجر کو دھویا تو
تمہاری آستینوں سے
ہمارا خون ٹپکے گا
ہمارے خون کی خوشبو
سربازار بولے گی
ہزاروں راز کھولے گی
ابھی ہم کچھ نہیں کہتے
حقیقت کہنے والوں کی
زبانیں کاٹی جاتی ہیں
حقیقت سننے والوں کا
برا انجام ہوتا ہے
سر بازار رسوائی
مقدر کر دی جاتی ہے
جو لکھتا ہے حقیقت کو
وہ جاں سے ہاتھ دھوتا ہے
جو اٹھتی ہے گواہی کو
وہ انگلی کاٹ دیتے ہیں
وہ سر جو جھک نہیں پاتا

وہ شانے پر نہیں رہتا
جو چہرہ بول اٹھتا ہے
وہ پہچانا نہیں جاتا
حقیقت پھر حقیقت ہے
مگر مانا نہیں جاتا
ابھی ہم کچھ نہیں کہتے
ابھی تو میری دنیا کا
ہر اک دستور الٹا ہے
جو الٹا ہے وہ سیدھا ہے
جو سیدھا ہے وہ الٹا ہے
جو پھولوں سے بھی نازُک ہو
یہاں پر خار کہلائے
وفا و عہد کا پیکر
یہاں غدار کہلائے
ملا ہے ہر کمینے کو
خطاب عزت مآبی کا
سبب کیسے کوئی سمجھے
تباہی کا خرابی کا
یہاں جو شمعِ محفل ہو
وہی مادام کہلائے
حقیقت کی زباں میں جو
سرائے عام کہلائے
کھڑی ہے چپہ چپہ پر
برائی دام پھیلائے
ابھی ہم کچھ نہیں کہتے

یہاں پر بولنے والی
زبانیں کھینچی جاتی ہیں
یہاں پر دیکھنے والی
نگاہوں میں اگر کوئی
ذرا بھی ناگواری ہو
تو ان کو پھوڑ دیتے ہیں
کسی کو اپنے کانوں میں
غلط باتوں سے بچنے کو
جو انگلی ٹھونستے پایا
تو ایسے نا مہذب کی
سزا ہے کھولتا سیسہ
اگر حالات پر لہجہ
کسی کا تلخ ہو جائے
تو لہجہ کی وہی تلخی
اسی کی روح کے اندر
کچھ ایسے گھولی جاتی ہے
کہ اس کے پورے پورے سے
لہو کا ایک اک قطرہ
ٹپک کر بہہ نکلتا ہے
ابھی ہم کچھ نہیں کہتے
سنا ہے ہم نے لوگوں سے
یہاں انصاف ملتا ہے
بہت شفاف ملتا ہے
یہاں پر جب عدالت ہو
تو دولت کی وکالت ہو
زباں کوئی عدالت کی
برائی میں نہ کھلتی ہو

کسی مظلوم کے حق میں
گواہی پر نہ کھلتی ہو
گواہی ظلم کے حق میں
اگر ہو پیش کی جائے
مگر مظلوم کے حق میں
اگر کوئی زباں کھولے
وہ اپنی جان کو رو لے
یہاں ایمان بکتا ہے
یہاں انسان بکتا ہے
یہاں پر دام لگتے ہیں
کوئی بے دام بکتا ہے
یہاں پر جرم کرنے پر
بڑے انعام ملتے ہیں
نوازش ان پہ ہوتی ہے
بڑے اکرام ملتے ہیں
خزانہ لوٹنے والے
بڑے انعام پاتے ہیں
مرادیں پوری ہوتی ہیں
بری ہو ہو کے جاتے ہیں
جو خالی ہاتھ ہوتے ہیں
وہی بدنام ہوتے ہیں
انہیں کے سر پہ دنیا کے
سبھی الزام ہوتے ہیں
یہاں مظلوم کو زنداں کی
خوش خبری سناتے ہیں
یہاں مقتول کو قاتل
بناتے ہیں بتاتے ہیں

لہو کو چوسنے والا
یہاں پہ سرخ رو ٹھہرے
مگر مقتول کا دعویٰ
بہت بے آبرو ٹھہرے
یہاں عسرت برائی ہے
یہاں غربت برائی ہے
یہاں پر آبرو مجرم
یہاں غیرت برائی ہے
یہاں عزت مآبوں کی
بہت پگڑی اچھلتی ہے
شرافت کی یہاں ہر سو
بڑی تذلیل ہوتی ہے
برے انعام والے ہیں
بھلے الزام والے ہیں
برے انجام والے سب
بہت ہی نام والے ہیں
عجب دورِ زمانہ ہے
حقیقت بھی فسانہ ہے
ابھی ہم کچھ نہیں کہتے
سنا ہے ہم نے لوگوں سے
یہاں قانون چلتا ہے
یہاں قانون چلتا ہے
ذلیلوں کا رذیلوں کا
سفیروں کا وزیروں کا

سراسر بے ضمیروں کا
یہاں قانون چلتا ہے
غریبی پر امیری کا
شریفی پر کمینی کا
بھلائی پر برائی کا
بروں کی بادشاہی کا
ابھی ہم کچھ نہیں کہتے
کہ ہم سب بے ضمیرے ہیں
برائی کے سفیرے ہیں
کسی مظلوم کے حق میں
گواہی دے نہیں سکتے
کسی ظالم سے ہم کوئی
بھلائی لے نہیں سکتے
کسی ظالم سے آنکھوں کو
ملانا ہی نہیں آتا
حقیقت میں حقیقت کو
بتانا ہی نہیں آتا
ابھی ہم کچھ نہیں کہتے
یہاں پر بولنے والا
ابھی موسم نہیں آیا
مگر موسم تو آئے گا
ضمیروں کو جگائے گا
ہر اک مظلوم کا چہرہ
ہنسے گا مسکرائے گا

حبیب الرحمٰن

غیرت ہے بڑی چیز

میری نئی کتاب کو کس نے مجھ سے پوچھے بغیر ہاتھ لگایا؟ انتہائی غصہ میں اسجد نے کہا۔

کسی نے نہیں لگایا، زارا نے بس مصنف کا نام دیکھ کے رکھ دی تھی، اماں نے کہا۔ ہو ہی نہیں سکتا، کتاب کے کئی صفحات پرانے محسوس ہو رہے ہیں، ایک صفحہ تو مڑا بھی ہوا ہے .....تنفر سے اسجد بولا۔ اپنی ذات، اور ذات سے وابستہ ہر شے کے متعلق وہ بہت حساس اور غیرت مند تھا۔ اخبار آتا تو اسے نیا، اخبار چاہئے ہوتا اگر بھولے سے کسی نے صفحہ کھول کر پڑھ لیا ہوتا تو وہ اس دن کے اخبار کو ہاتھ ہی نہ لگاتا تھا۔ بقول اس کے پرانا اخبار اور ٹھنڈا پراٹھا دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں..... بدمزہ!

اگر بات اخبارات اور کتاب تک رہتی تو بھی ٹھیک تھا وہ تو اپنے سے متعلقہ ہر خبر خود فراہم کرنے کا شوقین تھا۔ اپنا رزلٹ خود بناتا۔ اپنی شاپنگ خود کرتا اور شاپنگ کر کے چھپا کر رکھتا۔ صرف پہنتے یا استعمال کرتے وقت اس کی شاپنگ دیکھی جاسکتی تھی اور بس! تمام اشیاء صاف ستھری، پیکنگ میں مدتوں پڑی رہتیں۔ جب اپنے پرانے کپڑے، چھوٹے جوتے، پرانی نصابی کتب کسی کو دیتا تو کوئی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ ان جوتوں کو کسی نے پہنا بھی ہوا ہے، یہ کپڑے کسی کے تن سے لگ چکے ہیں اور یہ کتب کسی کی نظروں کا مرکز یا کسی کے ہاتھوں میں بھی رہ چکی ہیں۔ نہ کپڑوں پر داغ دھبہ نہ جوتے بدرنگ۔ جب وہ اتارنے کے بعد واپس ڈبے میں رکھتا تو پالش کر کے رکھتا تھا۔ آپ اسے جنونی کہیں یا جھلا لیکن وہ ایسا ہی تھا۔

اس کا چھوٹا بھائی اطہر اتنا ہی اس کے برعکس تھا۔ ہر خریدی چیز کی نمائش کرنے والا، کوئی بھی چیز سستی ہو یا مہنگی، مالکانہ حقوق سب کے نام پر کروانے والا .....کھلنڈرا، لاابالی.....ایک دن تھا تو دوسرا رات۔ ایک دوستانہ مزاج رکھنے والا تو دوسرا الگ تھلگ رہنے والا۔ اسے پروا ہی نہ ہوتی کہ اس کی کون سی چیز اٹھا کر کسی مستحق کو دے دی گئی ہے یا گم ہوگئی ہے۔

زندگی کی انہی بھول بھلیوں سے گزرتے گزرتے دونوں کا تعلیمی کیریئر اختتام کو پہنچا۔ ایک نے فون پر ہی یونیورسٹی سے رزلٹ بتا دیا۔ امی جان مبارک ہو پاس ہوگیا ہوں، اسّی فیصد نمبر بن رہے ہیں۔

دوسرے نے گھر آ کر رزلٹ بتایا۔

اکیاسی فیصد نمبر ہیں۔ اور بس!!

پر اسے علم ہی نہ تھا کہ خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں۔ کامیاب ہوئے، تنخواہ ملی، رشتوں کی لائن تو پہلے ہی لگی ہوئی تھی اب تابڑ توڑ حملوں کی طرح سلسلہ شروع ہوا۔

ایک نے کہا میری طرف سے ایک ہی فرمائش ہے کہ میں لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہوں ملنا چاہتا ہوں۔ آخر جس کے ساتھ ساری زندگی گذارنی ہے اس کا اندازہ تو ہونا چاہئے۔

شریعت کی انگلی پکڑ کر گھر والوں نے قریبی ملنے والوں کی بچی مہر افشاں کی تجویز منظور ہونے کے بعد ملاقات بھی کروادی۔

ملاقات دونوں طرف سے کامیاب ٹھہری اور رشتہ طے پا گیا۔

اطہر کے لئے بھی اسی طرح ماں نے رشتہ پسند کیا اس کے پاس بھی آپشن موجود تھا دیکھنے اور ملنے کا، لیکن اس نے بے نیازی سے انکار کر دیا۔

''بس امی آپ نے اور زارا نے دیکھ لیا نا.....کافی ہے، آپ کی چوائس اچھی ہی ہوگی''

سو اس کا رشتہ انجم نامی لڑکی سے طے پا گیا۔

دونوں بہت شریف، معزز اور امیر خاندان سے تعلق رکھتی تھیں ۔ دونوں گھرانوں کے تعلقات میں رشتہ طے پانے کے بعد مثبت ہی اضافہ ہوا تھا۔ شادی باہمی مشاورت سے نومبر کے آخری ہفتہ میں طے پائی۔

شادی کے دن کے لباس، جوتے، جیولری، میک اپ کے لئے پارلر سے لے کر ہر چیز دونوں گھرانوں نے مشاورت سے طے کر لی تھی ۔حق مہر کتنا ہو، بارات کے ساتھ کتنے لوگ ہوں گے ولیمہ کے دن کا مینو تک پہلے ڈسکس کر لیا گیا تھا کہ دونوں تقریبات میں یکسانیت نہ ہو جائے۔

سامان شادی سے کتنے دن پہلے بھجوانا ہے، کمروں کی سجاوٹ کیسے ہو گی، یہ بھی ان نکات میں شامل تھے جن پر کھل کر اظہار خیال ہو چکا تھا۔

پہناوٴنیاں کس طرح کی ہوں، صرف اہل خانہ کی یا خلیا ساس سسر، ماموں سسر وغیرہ کے یا ان کے بچوں کے بھی، یہ بھی فریقین نے بندوبست کر لیا تھا۔

سب کچھ بہت اچھا تھا جب شادی سے چالیس گھنٹے گھر میں ایک معمولی سا ایشو زیرغور آیا۔ پہلے نقطہ نظر بیان ہوا۔ پھر خلاف معمول بلند آوازوں میں اس کے بعد تناوٴ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ دونوں بھائیوں اطہر اور اسجد کی دو پارٹیاں بن گئی تھیں ۔گھر کے تمام افراد بمعہ قریبی عزیز و اقارب کے موجود تھے جب اسجد نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

''فوٹوسیشن کے لئے کون سے فوٹوگرافر سے ڈیل کی ہے؟''

''فوٹوسیشن؟'' اطہر نے حیرانی سے پوچھا۔''وہ کس کا؟''

''ارے ہمارا۔ شادی کے دن ۔تم نے نہیں دیکھا فوٹو شوٹ ہوتا ہے ڈریسنگ روم میں۔ اور پھر فنکشن کی کوریج''

''کیا مطلب ہے یعنی ہماری دلہنوں کا فوٹو شوٹ ہوگا!'' ناگواری سے اطہر نے کہا۔

''ہاں ۔تو اور کیا؟'' اسجد نے اس انداز میں کہا جیسے دنیا جہاں میں اطہر سے زیادہ بے وقوف یا بدھو کوئی نہ ہو۔

''کیا ہو گیا ہے یار، یہ شادی کا ضروری حصہ ہے، ساری زندگی کے لئے یادگار اپوئنٹ ہوتا ہے!'' چڑ چڑ کرتے ہوئے اسجد نے کہا۔

''سوری بھائی میں یہ ماڈلنگ اپنی بیوی سے نہیں کروا سکتا، اطہر نے کچھ نروٹھے انداز سے کہا۔

''اس میں ہرج کیا ہے!'' اسجد نے جرح کی

''ہرج؟ اسجد بھائی آپ یہ کہہ رہے ہیں جن کی کتاب کو بھی کوئی ہاتھ لگا دے تو آپ سیخ پا ہو جاتے ہیں، دس سال پرانے جوتوں تک کو پالش کر کے ڈبوں میں محفوظ رکھتے ہیں، آپ کو اتنی بات بھی نہیں پتہ کہ بے جان اشیاء خواہ کتنی ہی قیمتی ہوں ان سے کھربوں گنا قیمتی عورت کی عزت اور عصمت ہوتی ہے ۔ میں اس پر مووی میکر کی، فوٹوگرافر کی ہوسناک گندی، میلی نظریں ڈلواوٴں......کبھی نہیں......میری غیرت گوارہ نہیں کرتی کہ میری بیوی کی دلہن بنی پہلی مسکراہٹ، اس کے حسن، اس کے بناوٴ سنگھار پر کسی غیر کی نظر پڑے......''

''لیکن......'' اسجد نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا اور پھر بند کر لیا۔ ایک بات تو طے تھی کہ اطہر کی بات بہت مدلل اور وزنی تھی ۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

گیند اسجد کی کورٹ میں تھی!!

پھر سب نے دیکھا اس نے جیب سے سیل فون نکالا، ایک نمبر ملایا اور سلام دعا کے بعد آہستہ سے کہا۔

''سوری یار، فوٹو سیشن ہم گھر میں ہی مینیج کر لیں گے، تم اس اپائنٹمنٹ کو کینسل سمجھو میں نے کون سا ایڈوانس دیا تھا۔''

اطہر کا چہرہ کھل اٹھا۔

☆......☆......☆

افشاں نوید

اتنا قریب!

بات تو یہ ہے نا کہ میں نے کب اللہ کو محسوس کیا!

وہ تو پھولوں میں خوشبو کی طرح اور ہوا میں آکسیجن کی طرح ہر وقت ہر جگہ میرے چاروں طرف موجود ہے۔ وہ تو چاہتا ہے کہ ہم اس کو محسوس کریں، بلکہ ایسے جیسے آتی جاتی سانسوں کو محسوس کرتے ہیں اور دل کی دھڑکن کو.....

مگر ہمارے چاروں سمت اتنا شور ہے..... اتنی آوازیں..... کہ ہم محسوسات کی اس دنیا میں داخل بھی نہیں ہو پاتے۔ پھر بھی معرفت کے وہ لمحے تو کبھی نہ کبھی ہماری زندگی میں آ ہی جاتے ہیں۔

کتنی دلدوز تھی وہ خبر..... وہ جو ابھی دادو سے آئی تھی کہ سلطانہ آپا کے جواں سال بیٹے کا ایک انتہائی خطرناک حادثے میں انتقال ہو گیا ہے۔ دو معصوم دو اور چار برس کے بیٹے چھوڑے ہیں اس نے..... ایک اسکوٹر سوار کو بچاتے ہوئے گاڑی ایک گڑھے میں گر گئی۔ ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا چچازاد بھائی محفوظ رہا اور وہ گاڑی سے باہر موجود گڑھے میں جا کر دماغ کی نس پھٹنے سے موقع پر ہی داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ چچازاد بھائی بتا رہا تھا کہ یوں لگتا تھا اس کو کسی نے ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر باہر نکالا ہو..... یقیناً وہ ملک الموت ہی ہو سکتا ہے۔ دل غم کے بوجھ تلے دب سا گیا۔ رختِ سفر باندھ کر اگلے دن دادو پہنچ گئے۔ ایک کہرام برپا تھا موت کے گھر میں..... سلطانہ آپا نیم غنودگی میں برابر کلمہ طیبہ پڑھ رہی تھیں۔

جب کچھ حواس بحال ہوئے تو بولیں ''بیٹے کو ہسپتال لے گئے..... میں بھی پیچھے پیچھے ہسپتال پہنچ گئی اس کے باپ کے ساتھ..... جلدی سے وضو کیا اور جائے نماز بچھانے لگی کہ رب سے نماز حاجت پڑھ کر اس کی زندگی کی بھیک مانگوں گی۔ ابھی نیت باندھی بھی نہ تھی کہ دوسرا بیٹا آ کر روتا ہوا مجھ سے لپٹ گیا ماں..... بھائی چلا گیا! میں دل تھام کر وہیں پڑے بینچ پر بیٹھ گئی۔ ابھی تو میں نے دعا بھی نہ کی تھی۔ وہ تو دعا سے پہلے ہی چلا گیا۔ مجھے تو اس کی زندگی مانگنا تھا زندگی دینے والے سے..... میں تو مانگ بھی نہ سکی۔ تب میں نے سوچا کہ اگر میں اس کی زندگی کی دعا مانگ لیتی اور پھر اس کے انتقال کی خبر ملتی تو ممکن ہے شیطان میرے دل میں وسوسہ ڈالتا کہ دیکھو تمہاری دعا قبول ہی نہیں ہوئی۔ شاید ساری زندگی میرا دل شکوہ کرتا رہتا تم رب سے مانگ کر نامراد رہیں۔ سو میرے رب نے میرا مان ٹوٹنے نہ دیا۔ وہ تو میری ہر بات سنتا ہے اور کبھی تو دعائیں لبوں پر آنے سے پہلے ہی قبول بھی کر لیتا ہے شکر ہے میرے رب کا احسان ہے کہ اس نے بیٹا تو لے لیا مگر میرا مان سلامت رکھا۔''

کتنی بڑی، کتنی گہری بات..... وہ ناخواندہ ماں شعور اور معرفت کی کن منزلوں پر تھی۔ کتنا قریب محسوس کیا اس ہستی کو جو نظر نہیں آتی مگر موجود ہے!!

اور پھر وہ بھی ملی ایک دن!

کراچی میں نیول ہاؤسنگ سوسائٹی میں گھر ہے اس کا..... بہت پرتکلف۔ گھر کے بڑے سے لان میں ٹریڈمل رکھی تھی۔ مالی پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ گھر کے باہر ڈرائیور گاڑی کی صفائی ستھرائی میں مشغول تھا۔ میں اس کو جانتی تو نہ تھی، کسی نے کہا کہ مل لوں نئی نئی آئی ہے کراچی..... ماہر نفسیات ہے، اچھی شخصیت کی مالک، بہت جلد دوست بن جاتی ہے۔ سو یوں ہی بلا ارادہ گاڑی اس کے گھر کی سمت موڑ لی۔

اس نے بہت گرمجوشی سے استقبال کیا جب میں نے اس کی دوست کا حوالہ دیا کہ اس نے کہا ہے ملاقات کر لوں۔ ملازم نے پرتکلف ناشتہ لگا دیا۔ اتنے میں اس کے بچے اسکول سے آ گئے۔ جلد ہی وہ ان کو

فارغ کرا کے پھر آ کر بیٹھ گئی۔

باتوں باتوں میں بولی۔''میں اللہ میاں سے کہتی ہوں کتنا خیال رکھتے ہیں ناں آپ میرا..... ہر وقت تو آپ کو میری ہی فکر لگی رہتی ہے، کتنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ ہر وقت مجھ پر ہی نظر رہتی ہے آپ کی۔ کائنات کے دیگر امور کتنے متاثر ہوں گے آپ کے۔ جب کہ آپ ہر وقت تو میری فکر میں لگے رہتے ہیں۔''

شانوں تک کٹے ہوئے بالوں میں اس نے ہیئر بینڈ لگایا اور تھرماس سے کافی مگ میں ڈالنے لگی۔ میری نظریں ایک لمحہ بھی اس کے سراپے سے ہٹنے کو تیار نہ تھیں۔

فقہی اعتبار سے تو بہت کچھ کلام کیا جا سکتا ہے اس کی اس سوچ پر یا ان لفظوں پر..... بہت کچھ قابل بحث ہو سکتا ہے اس کی ان معصوم باتوں میں .....لیکن کتنی سچائی، رب کے ساتھ کیسا تعلق ..... کس طرح محسوس کرتی ہے وہ رب کو اپنے اتنے قریب! وہ تو سب کے اتنے ہی قریب ہے، سب کا اتنا ہی خیال رکھتا ہے۔ وہ تو پتھروں کے کیڑوں تک کو رزق مہیا کرتا ہے۔ اور ہم اشرف المخلوقات کے تو ناز اٹھاتا ہے وہ۔ کیونکہ بہت بہت پیاری ہے اس کو اپنی تخلیق.....لاکھ نافرمانیاں ہم نے کیں پر آج تک اس نے نہ دھتکارا نہ رزق بند کیا ہمارا۔ پھر ہم اس کو محسوس کیوں نہیں کرتے جو اتنے.....اتنے قریب ہے ہمارے.....!!!

''اللہ جی آپ کتنا خیال رکھتے ہیں نا میرا'' جب کبھی شکرانِ نعمت کے یہ جملے میرے لبوں تک آتے ہیں، ڈاکٹر شائستہ کا بھولا بھالا سراپا میرے چشم تصور میں آ جاتا ہے جو رب کو رب کہتی ہیں نہیں بلکہ محسوس کرتی ہے!!

☆.....☆.....☆

فرحی نعیم

معمّہ

''پھراماں کب جاؤ گی ؟'' شعیب ماں کے پاس بیٹھا بڑی عاجزی سے پوچھ رہا تھا۔اس کے اسطرح پوچھنے پر اماں کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

''ارے تاب رکھو چلی جاؤنگی ایک دو دن میں۔''

''ایک دو دن،اماں آج ہی چلی جاؤ۔'' وہ جیسے منت کر رہا تھا۔

''توبہ ہے ،تمہاری بہن آجائے پھر اسکے ساتھ ہی تو جاؤنگی، اکیلی جاتی کیا اچھی لگوں گی میں۔'' اماں کو اس کے بے صبرے پن پر تاؤ آیا۔

''تو بلالاؤں میں تہمینہ کو؟'' وہ جلدی سے بولا۔

''اگر آجائے تو بلالاؤ۔'' اماں نے جان چھڑائی ،انہیں معلوم تھا کہ تہمینہ کس طرح بچوں میں گھری رہتی ہے اُسے تو ماں کے گھر آنے کی بھی فرصت بڑی مشکل سے ملتی تھی۔اور پھر شعیب نے نہ جانے تہمینہ سے کیا کہا کہ وہ شام کو ہی چھوٹے بچے کو بغل میں دبا کر آ گئی اور آتے ہی اپنی مصروفیت کی کہانی سنانے بیٹھ گئی۔

''اماں کیا بتاؤں سر کھجانے کی فرصت نہیں ہے۔اس شعیب نے ایسی ہتھیلی پر سرسوں جمائی کہ مجھے آتے ہی بن پڑی۔اب جلدی چلو مجھے بڑے کام ہیں۔''

''ہاں ہاں جانتی ہوں ، سارے شہر کے مسائل تم ہی کو تو حل کرنے ہیں۔'' اماں نے جل کر کہا اور برقع اوڑھنے لگیں۔

پھر دونوں ساتھ کی گلی میں رہنے والے اکرم صاحب کے گھر چلی گئیں جن کی بیٹی راحیلہ کا رشتہ وہ شعیب کے لئے مانگ رہی تھیں ۔ شعیب، راحیلہ کو کافی عرصے سے پسند کرتا تھا اور اب وہ بڑی سنجیدگی سے اُس سے شادی کرنے کا سوچنے لگا تھا۔اماں نے جیسے ہی اسکی شادی کرنے کا ارادہ کیا اور اس سلسلے میں جب اُس سے ذکر کیا تو جھٹ اُس نے راحیلہ کا نام لے دیا۔راحیلہ، اماں کی بھی دیکھی بھالی تھی۔انہیں بھی کیا اعتراض ہوسکتا تھا، انہوں نے حامی بھر لی ۔اب سارا مسئلہ وہاں جانے کا تھا۔اماں تہمینہ کا انتظار کر رہی تھیں اور تہمینہ کو فرصت نہ تھی ، اسی طرح ایک ہفتہ گذر گیا تھا۔دوسری طرف شعیب سے اب صبر نہ ہو رہا تھا وہ دن رات اماں سے پوچھتا اور انہیں وہاں جانے کے لئے اکساتا۔اور پھر زیادہ دن نہ گذرے کہ راحیلہ کے گھر سے مثبت جواب آ گیا۔اماں نے خوشی میں ساری گلی میں مٹھائی بانٹی۔

''مبارک ہو خالہ میں ابھی گھر آیا تو امی نے مجھے مٹھائی دی کہ شعیب کی بات پکی ہوگئی ہے۔یہ شعیب تو بڑا چھپا رستم نکلا۔مجھ کو بھی کسی بات کی ہوا نہ لگنے دی۔کہاں کی ہے آپ نے شعیب کی منگنی؟ کون ہے؟ کیسی ہے؟'' کاظم نے آتے ہی پہلے تو شکایت کی پھر کئی سوال کر ڈالے۔

''ارے تمہیں نہیں پتہ۔'' اماں کو بھی حیرت ہوئی کہ شعیب اور کاظم تو بڑے گہرے دوست تھے۔ایک محلّہ ،ایک سکول وہ تو بچپن سے ہی ایک دوسرے کے گھر ہر وقت آتے جاتے تھے۔شعیب نے کاظم سے اس بات کا تذکرہ نہ کیا تھا اس بات نے اماں کو حیرانی میں ڈال دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اماں مزید کچھ کہتیں کہ شعیب بھی آ گیا اور آتے ہی کاظم نے اس کو پکڑ لیا۔پہلے تو اسکو خوب لتاڑا پھر اسکو پکڑ کر وہیں صحن میں بچھے تخت پر بیٹھ کر اُس سے پوچھنے لگا۔

''ارے یار تم بھی اُسے جانتے ہو، اکرم چاچا کی بیٹی راحیلہ۔'' شعیب مسکرا کر بولا اور کاظم کے تو چہرے پر ایک رنگ آ کر گذر گیا۔ کیا کہہ رہے ہو تم ،تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی۔'' کاظم اس کے

پیچھے چھپی کہانی کی تہہ تک یکدم ہی پہنچ گیا تھا۔

''کچھ نہیں یار۔'' شعیب کچھ کھسیا کر رہ گیا تھا۔ اگر چہ اس نے کاظم کو کچھ نہیں بتایا تھا لیکن وہ پھر بھی بہت کچھ جان گیا تھا اور اسی طرح بہت سے دن گذر گئے اماں راحیلہ کو بہو بنا کر لے آئیں۔ دن بڑے مطمئن گذر رہے تھے ایک بیٹے نے شعیب اور راحیلہ کی زندگی کو بہت مصروف کر دیا تھا۔ شادی کو تین سال گذر گئے شعیب گھر اور بچے کی ذمہ داریوں میں الجھ گیا تھا لیکن ان دونوں کی دوستی اسی طرح قائم تھی۔ کاظم کی بھی شادی اس دوران ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

''یار بہت عرصہ ہو گیا کوئی تفریحی پروگرام نہیں بنا۔'' شعیب اور کاظم رات کے کھانے سے فارغ ہو کر گھر کے باہر بیٹھے تھے کہ باتوں کے درمیان شعیب نے کاظم سے کہا۔ ''ہاں میں بھی پچھلے دنوں یہی سوچ رہا تھا۔ گھر، دفتر اسکے جھمیلے، فرصت ہی نہیں ملتی۔ میں دوسرے دوستوں سے بات کرتا ہوں پھر کوئی پروگرام بناتے ہیں۔'' کاظم نے جواب دیا اور پھر اس نے پروگرام بنانے میں دیر نہیں لگائی اگلے دن چھٹی تھی۔ اس نے اپنے اور شعیب کے چار اور مشترکہ دوستوں کے ساتھ ساحل سمندر پر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ چنانچہ سویرے ہی سب اکٹھے ہو کر ساحل کی طرف روانہ ہوئے۔ سارے دوستوں نے مل کر خوب ہلا گلا کیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور پھر سب نے واپسی کی ٹھانی۔ سامان وغیرہ باندھ کر شعیب اور کاظم نے ایک دفعہ اور پانی میں جانے کا پروگرام بنا لیا۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کافی آگے تک بڑھ گئے تھے۔ پیچھے سے دوستوں نے آوازیں بھی لگائیں لیکن دونوں نے ہی ان سنی کر دی۔ وہ لوگ پانی کی کشش میں بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ پانی ان کی کمر تک پہنچ رہا تھا کہ اچانک ہی شعیب کا پیر پھسلا اور آناً فاناً میں وہ سمندر کی لہروں کی لپیٹ میں آ گیا۔ کاظم نے اُسے بچانے کی بڑی کوشش کی لیکن بے رحم موجوں نے شعیب کو دور اچھال دیا۔

کاظم بڑی مشکل سے واپس آیا۔ سارے دوست بے بسی سے سمندر کی طرف دیکھ رہے تھے کسی کو بھی تیرنا نہیں آتا تھا جو آگے بڑھ کر شعیب کو بچانے کی کوشش کرتا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے لہروں نے دو تین مرتبہ شعیب کو اچھالا پھر اپنی آغوش میں لے لیا۔ سب جیسے سکتے میں آ گئے تھے۔ فون کرنے پر ریسکیو بوٹ پہنچ گئی تھی۔ کافی کوششوں کے بعد شعیب کی لاش ملی۔ کیا سے کیا ہو گیا تھا آنے سے پہلے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شعیب، انکا پیارا دوست، جو اپنے پیروں پر چل کر آیا ہے واپسی کاندھوں پر ہو گی۔ راحیلہ کو تو جیسے سکتہ ہی ہو گیا تھا وہ اپنے آپ سے، بچوں سے ہر کسی سے جیسے بے گانہ ہو گئی تھی۔ شعیب کی اچانک اور ناگہانی موت سے اُسے نا قابل برداشت صدمہ پہنچا تھا۔ بچہ ابھی بہت چھوٹا تھا اور اسے قدم قدم پر ماں کی ضرورت تھی۔ وقت اور حالات نے اس سے اس کا باپ تو چھین لیا تھا لیکن ساتھ ہی جیتے جی ماں بھی غافل ہو گئی تھی۔

کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہے آہستہ آہستہ شاید بچے کے لئے ہی وہ زندگی کی طرف واپس آنے لگی۔ ماں باپ کے بہت کہنے سننے پر راحیلہ نے پھر سے اپنے آپ کو دنیا کے کاموں کی طرف مائل کرنا شروع کیا تھا۔ عدت ختم ہونے کے بعد وہ اپنے میکہ آ گئی تھی۔ ابھی شعیب کے انتقال کو سال بھی نہیں ہوا تھا کہ راحیلہ کے پیغام آنے لگے تھے۔ اس کی عمر ہی کیا تھی صرف 23 سال اور اتنی کم عمری میں وہ شادی شدہ، ایک بچے کی ماں اور پھر بیوہ بھی ہو گئی تھی۔ وقت نے اسکے ساتھ بڑا سنگین مذاق کیا تھا۔ راحیلہ کی ماں اسے دوسری شادی پر آمادہ کرنے لگیں لیکن اس نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔

''امی مجھے شادی نہیں کرنی کتنی دفعہ آپ سے کہوں۔'' وہ تنگ آ چکی تھی۔ ''ایسے کیسے زندگی گذرے گی ابھی تمہارے سامنے ایک لمبی زندگی ہے، اکیلے کیسے سنبھال پاؤ گی۔'' امی آج پھر اسے لیکر بیٹھی تھیں۔

''سب ہو جائے گا، اللہ مالک ہے۔''

''ارے کیسے ہو جائے گا، اور یہ اللہ ہی کا تو حکم ہے دوسری شادی کی اجازت ہے۔ کوئی اللہ نے یہ تھوڑی کہا ہے کہ جوگ لیکر بیٹھ جاؤ اللہ نے تو ہمارے لئے آسانیاں بنائی ہیں۔ تم تو خوش نصیب ہو کہ تمہارے لئے پھر پیغام آ رہے ہیں ورنہ یہاں تو کنواریوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔''

''آخر اب کون آ گیا جو آپ اتنا اصرار کر رہی ہیں۔'' راحیلہ عاجز آ کر بولی۔

'' کاظم کی ماں اور بہنیں آئی تھیں۔'' امی بھی فوراً اصل بات پر آ گئیں۔'' کاظم کی ماں؟ لیکن کاظم کا تو کوئی بھائی نہیں ہے وہ کس کا رشتہ لیکر آئیں؟'' راحیلہ اچنبھے سے بولی۔

''وہ کاظم کا پیغام لائی ہیں، وہ تم سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔''

''لیکن کیوں؟ وہ تو شادی شدہ ہے بال بچوں والا، اس کی بیوی بھی اچھی خاصی ہے اسے کیا ضرورت ہے۔'' راحیلہ حیران تھی۔

''ہاں وہ تم سے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں۔ اچھا خاصا ہے۔ دیکھا بھالا بھی اور تم بھی اسے اچھی طرح جانتی ہو۔ اس کی ماں بے حد اصرار کر کے گئی ہے اگلے ہفتے آئے گی بتاؤ میں کیا جواب دوں۔'' امی اُس سے پوچھ رہی تھیں۔

''انکار'' راحیلہ نے مضبوطی سے جواب دیا۔

لیکن اس دفعہ گھر والوں نے راحیلہ کی ایک نہ چلنے دی ادھر کاظم کے گھر والوں کی طرف سے بھی بے حد دباؤ تھا۔ اسے بچوں کا واسطہ دے کر بالآخر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا اور یوں وہ کاظم کے گھر اس کی دوسری بیوی بن کر چلی آئی۔ کاظم اس کا بہت خیال رکھتا اس کی اور بچے کی ہر ضرورت پوری کرتا۔ اس نے بڑی چاہت سے راحیلہ کو اپنے گھر میں رکھا ہوا تھا اگرچہ شعیب کا دکھ بھولنے والا تو نہیں تھا لیکن وہ آہستہ آہستہ گھر گرہستی میں لگ کر بہل چکی تھی وہ کاظم کے ساتھ سمجھوتہ کر چکی تھی۔ اس کا غم کسی حد تک کم ہو چکا تھا۔ اس دوران وہ کاظم کے بھی دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

آج کاظم بڑا خوش تھا اس کی ترقی ہوئی تھی اور اس خوشی میں وہ راحیلہ اور بچوں کے لئے تحائف لایا تھا۔ اس نے راحیلہ کا ہاتھ پکڑ کر بڑا خوبصورت کنگن اسے پہنایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم کو معلوم ہے راحیلہ میں تمہیں کب سے پسند کرتا ہوں؟''

راحیلہ نے جواب میں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔'' جب تمہاری شعیب سے شادی بھی نہیں ہوئی تھی اس سے بھی پہلے۔'' راحیلہ کی نظروں میں حیرانی دیکھ کر وہ مزید بولا۔'' اصل میں تم مجھے بہت پہلے ہی سے اچھی لگتی تھیں اور میں تم سے شادی کا بھی خواہشمند تھا لیکن کیا کرتا بے روزگار تھا۔ مجھے کوئی ڈھنگ کی نوکری ہی نہیں مل رہی تھی اور میری امی نے مجھے یہ الٹی میٹم دیا ہوا تھا کہ جب تک نوکری نہ لگ جاؤں کوئی میری شادی کا نام نہ لے کیونکہ اس وقت گھر کے حالات بھی ٹھیک نہ تھے۔ بہر حال پھر اچانک شعیب سے تمہاری منگنی کی اطلاع ملی۔ اگرچہ یہ میرے لئے بڑا شاک تھا لیکن کیا کرتا۔ شعیب میرا بڑا عزیز دوست تھا اس نے بھی مجھے تمہارے متعلق کبھی کوئی بھنک نہ دی تھی اور نہ ہی میں نے کبھی اسے بتایا تھا اور یوں میں نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا اور خاموش رہا۔ لیکن میرے دل میں تمہاری محبت پلتی ہی رہی۔ تمہاری شادی ہو گئی اور بعد میں نوکری ملنے کے بعد میں نے بھی شادی کر لی لیکن تمہیں پانے کا ارمان میرے دل میں پروان چڑھتا رہا۔ لیکن پھر.....'' وہ رکا'' مجھے موقع مل گیا بلکہ قدرت نے خود مجھے موقع فراہم کر دیا۔''

ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی، سمجھ میں نہ آنے والی معنی خیزی اسکے چہرے کا احاطہ کئے ہوئی تھی۔

''موقع؟ کیسا موقع؟'' راحیلہ جو خاموشی سے یہ انکشافات سن رہی تھی ایکدم ہی بری طرح چونکی تھی۔ دوسری طرف کاظم جو نہ جانے کس رو میں یہ سب کہتا چلا جا رہا تھا راحیلہ کے ایک دم ٹوکنے سے بری طرح ٹھٹک گیا اور فوراً ہی خاموش ہو گیا۔

''بتائیں آپ کیا کہہ رہے تھے؟'' راحیلہ نے ایک بار پھر اسے پوچھا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جیسے نیند میں تھا اور اب بیدار ہو چکا ہے۔

'' کچھ نہیں'' کاظم نے سنجیدگی سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا اور راحیلہ..... اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ کچھ سمجھنا بھی نہیں چاہ رہی تھی۔ بہت سی باتیں جو شعیب کی موت پر لوگ کر رہے تھے، وہ چہ میگوئیاں جن کو وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی، وہ تمام گرہیں جو بڑی سختی سے لگی ہوئی تھیں..... شاید انکا سرا کہیں نظر آ رہا تھا لیکن..... لیکن وہ انہیں سلجھانا نہیں چاہ رہی تھی، انہیں الجھا ہی چھوڑ دینا چاہتی تھی وہ سارا دن اور اگلے

کئی دن وہ بے حد الجھی رہی۔ ہر وقت شعیب کا مسکراتا چہرہ اسکی نظروں میں آتا، وہ سختی سے اسے جھٹکتی۔ بچوں اور گھر میں لگی رہتی ہر وقت کاموں میں گھری رہتی اور پھر بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گئی لیکن یہ معمہ آج کئی برس گذرنے کے بعد بھی حل نہ ہو سکا کہ اس دن شعیب کا توازن واقعی قائم نہ رہ سکا جس کی وجہ سے وہ لہروں میں کھو گیا یا اسے لہروں کے حوالے کر دیا گیا پھر اسے بچانے کی کوشش بھی صرف سرسری ہی کی گئی؟ کیا واقعی وہ اتفاقی حادثہ تھا یا اسے اتفاقی حادثہ کا رنگ دیا گیا تھا؟

.....☆.....☆.....☆

میرے مہربان

نئے گھر میں شفٹ ہونے کے بعد چار پانچ روز خوب مصروف گزرے۔ بچے اپنے اپنے کمرے سیٹ کرنے کے بعد اب میری بھی مدد کر رہے تھے۔ معمولات زندگی نارمل ہوئے تو سوچا کہ ہمسائے میں مل کر آتی ہوں۔

صبح جب ہمسائے میں پہنچی تو دروازہ ایک خاتون نے کھولا۔ اپنا تعارف کرایا کہ آپ کے پڑوس سے آئی ہوں اور ابھی شفٹ ہوئے ہیں۔ خاتون نے بڑی گرمجوشی سے اندر بلایا۔ میں نادیہ ہوں۔ خاتون نے اپنا تعارف کرایا۔ تھوڑی دیر بات چیت کے بعد بولی کہ میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔ میں نے اب کمرے کے چاروں طرف نظر دوڑائی تو نادیہ کی سلیقہ شعاری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چائے لے کر جب نادیہ آئی تو ساتھ میں ایک لڑکی اور بوڑھی خاتون بھی تھیں پتہ چلا کہ وہ نادیہ کی ساس اور نند ہیں اور آج کل اس کے پاس آئی ہوئی ہیں۔ چائے اور گپ شپ میں گھنٹہ گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ میں نے نادیہ سے اجازت چاہی تو بولی کہ میں نے کل شام اپنی کچھ دوستوں کو چائے پر بلایا ہے آپ بھی آیئے گا۔ مجھے بہت خوشی ہوگی۔

اگلی شام میں مقررہ وقت پر اُن کے گھر پہنچ گئی۔ ہم سب تعارف کے بعد بے تکلف ماحول میں بات چیت میں مصروف ہو گئے تو نادیہ چائے کے انتظامات کے لیے کچن میں چلی گئی۔ نادیہ کی نند گفتگو میں خوب حصہ لے رہی تھی۔ آخر نادیہ نے ہمیں ٹیبل پر بلا لیا۔ ڈائننگ ٹیبل حسن ذوق اور سلیقہ شعاری کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ ٹیبل ڈیکور سے لے کر برتنوں کی سیٹنگ تک بہت نفاست سے کام لیا گیا تھا۔ ہر کھانے کی ڈش کو بھی نادیہ نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا تھا۔ کھانا شروع ہوا تو سب نادیہ کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکے۔ ہر چیز میں بہت ذائقہ تھا۔ کھانے کے دوران میں نے عجیب سی چیز محسوس کی جب بھی کوئی تعریف کرتا تو نادیہ کی نند ساتھ ہی کہتی ہاں اگر اس کو اس طرح کر لیا جاتا یا پھر اس چیز میں ایسے نہ ہوتا تو یہ اور بہتر ہو سکتا تھا۔ اس کے انداز سے صاف عیاں تھا کہ اس کو نادیہ کی تعریف بری لگ رہی ہے۔ اس کے رویے کے برعکس نادیہ سب کو محبت سے ہر چیز پیش کر رہی تھی۔ اپنی ساس کو ہر چیز سب سے پہلے اور پوچھ کر ان کے سامنے رکھتی۔ خیر ہم سب نے نادیہ کی دعوت کو بہت انجوائے کیا۔ نادیہ کی ساس اور نند ایک ہفتہ بعد واپس جا رہی تھیں۔ میں نے بھی ان سے سلام دعا کے بعد اجازت چاہی اور نادیہ کو فارغ ہونے کے بعد اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

اگلے دو دن تک میں سارے گھر والوں کو نادیہ کی خصوصیات بتاتی رہی اور اللہ کا شکر ادا کرتی رہی کہ بہت اچھا ہمسایہ ملا ہے۔ گھر کی مصروفیات میں دو تین ہفتے کب گزر گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ مجھے نادیہ کا خیال آیا۔ میں نے سوچا وہ آئی نہیں چلو میں خیریت پوچھ کر آتی ہوں۔ دوسری دستک کے بعد جب کافی دیر گزر گئی اور پلٹنے ہی لگی تھی کہ نادیہ نے دروازہ کھول دیا۔ وہ نیند سے اٹھ کر آ رہی تھی اور کافی سست لگ رہی تھی میں نے معذرت چاہی تو بولی کہ آپ کی غلطی نہیں۔ دوپہر کے بارہ بجے نارمل انسانوں کے سونے کا وقت تو نہیں ہے۔ میں نے حال احوال پوچھا تو کہنے لگی کہ نیند اور سکون کے لیے anti-depressive دوائیاں لیتی ہوں جس کی وجہ سے کافی دیر تک سوتی رہتی ہوں۔ میری حیرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا بظاہر نظر آنے والی اتنی پر اعتماد اور ہر لحاظ سے بہترین خاتون اور ڈپریشن میں مبتلا ہے۔

دو تین ہفتے میں میری اور نادیہ کی بہت اچھی انڈرسٹینڈنگ ہو گئی۔ نادیہ اچھی سوچ رکھنے والی خاتون تھیں۔ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ انگلینڈ سے بھی کمپیوٹر ایجوکیشن میں ڈگری حاصل کی ہوئی تھی۔ شادی سے پہلے اسلام آباد کے بہترین سکول میں استاد رہ چکی تھیں۔ اسی دوران اس

نے بہترین استاد کا ایوارڈ بھی حاصل کیا تھا۔ گھر داری میں بھی کمال حاصل تھا۔ میری نظر میں نادیہ کی زندگی میں بظاہر صرف ایک کمی تھی کہ اس کے بچے نہیں تھے۔ ان کی شادی چونکہ بہت لیٹ ہوئی تھی اس لیے وہ اور اس کے شوہر دونوں اس بات کو اہمیت نہیں دیتے تھے اور اللہ کی رضا میں مطمئن تھے۔ پھر آخر کیا وجہ تھی کہ وہ ڈپریشن میں مبتلا تھی۔ آخر ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا کہ آخر کیا وجہ ہے تو نادیہ ہنستے ہوئے ماضی کے جھروکوں میں چلی گئی اور اپنی کہانی یوں سنانے لگی:

میں ابھی بی اے کے فائنل ایئر میں تھی کہ امی کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ہر جگہ علاج کے لیے لے کر گئے لیکن طبیعت بہتر ہونے کی بجائے بگڑتی چلی گئی۔ میں نے امی کی بہت خدمت کی۔ فائنل امتحانات امی کے ساتھ ہاسپٹل میں رہتے ہوئے دیئے۔ کینسر کے مرض نے امی کو زیادہ مہلت نہ دی اور وہ خالق حقیقی سے جا ملیں۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں جو شادی شدہ تھیں اور دو بہنیں اور تین بھائی چھوٹے تھے۔ بس سارے گھر کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ گئی۔ میرے ابو آرمی میں تھے اور وہ اپنی پوسٹنگ کے حساب سے مختلف جگہوں پر پوسٹ ہوتے تھے لیکن فیملی ساتھ نہیں لے کر جاتے تھے۔ ماں تھی جو ہم سب کو اپنے پروں میں چھپا کر یہاں بیٹھی تھی۔ امی کی وفات کے بعد لی ہوئی چھٹی ختم ہوئی تو ابو کو جانا پڑا۔ بڑی بہنیں بھی کچھ دنوں کے بعد چلی گئیں۔ ایسے میں ماں اور جز وقتی باپ بن کر اپنے بہن بھائیوں کو سنبھالا۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی ایک دم ہی اپنی عمر سے دس سال بڑے ہو گئے تھے۔ وقت کا پہیہ چلتا رہا۔ ایک بہن کی شادی سے فارغ ہو چکے تھے اب دو بھائیوں کے لیے رشتہ دیکھنے میں مصروف تھی۔ اسی دوران میرے بھی رشتے آتے رہے پسند بھی کر لیا جاتا لیکن پھر بات ایک دم ختم ہو جاتی۔ خیر میں نے بھائیوں کی تعلیم کی طرح شادی پر بھی ہر کام بہترین سے بہترین کیا۔ گھر کے تمام معاملات کے ساتھ ساتھ مالی معاملات بھی میرے ہاتھ میں تھے۔ آخر کار بھابیاں آ گئیں اور وہی ہوا بھابیوں کو میرا وجود کھٹکنے لگا۔ مجھ پر انہوں نے ہر وار کیا۔ جادو ٹونے سے بھی باز نہ آئیں ایک دن بڑی بہن آئی ہوئی تھیں تو ابو سے بولیں کہ آپ اس کی شادی کے لیے ہاں کیوں نہیں کرتے۔ میں جو دروازے پر کان لگائے کھڑی تھی ابو کا جواب سن کر حیران رہ گئی ''ابھی دو چھوٹے اور ہیں اس کی شادی کر دوں تو ان کو کون دیکھے گا۔''

میں جو ابھی تک بھابیوں کی زبانوں کے گھاؤ بڑے صبر سے برداشت کر رہی تھی اپنے باپ کی یہ بات سن کر اندر سے ٹوٹ گئی یہ پہلا موقع تھا کہ میں ڈپریشن کا شکار ہوئی۔ میری نیندیں اُڑ چکی تھیں اور میں بہت زیادہ ہائپر ہو چکی تھی۔ ایک سال علاج کرتے کرتے گزر گیا۔ ذہنی سکون کے لیے میں دوائیوں کی محتاج ہو کر رہ گئی تھی۔ آخر میری ایک دوست نے ابو کو قائل کر ہی لیا اور اپنی دوست کے بھائی سے میری شادی طے کروا دی۔ میرے شوہر کی یہ دوسری شادی تھی۔ پہلی شادی ملک سے باہر کی تھی جو کہ ختم ہو چکی تھی۔ میرے شوہر کا وسیع کاروبار تھا اور اپنے بھائیوں اور بہنوں سب کی کفالت کرتے تھے۔ میں نے کبھی اپنے شوہر اور ان کے گھر والوں کے معاملات میں دخل نہ دیا۔ لیکن ان کو خطرہ تھا کہ بیوی آ جانے پر بھائی کہیں ہاتھ نہ کھینچ لے۔ اصل میں تو ان کے بھائی بہن بھی اس شادی کے حق میں نہ تھے یہ تو میری ساس تھیں جو بیٹے کی محبت میں اُس کا اکیلا پن دور کرنا چاہتی تھیں۔ ابھی یہ جو میری ساس اور نند آئی ہوئی تھیں تو اس کو میرا سکون اور طرز زندگی دیکھ کر برداشت نہ ہوا اور جاتے جاتے میری نند کہہ گئی کہ کوئی غلط فہمی میں نہ رہے پیروں کے نیچے سے زمین نکلتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ اس کا یہ جملہ میرے دماغ پر کاری وار کر گیا۔ اور میں پھر ڈپریشن میں چلی گئی۔ بس اللہ کا شکر ہے میرے شوہر بہت اچھے ہیں اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔

نادیہ کی کہانی سن کر میں نے اس کی ہمت بندھائی اور تسلی دی کہ آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں اور توہمات کو ذہن میں جگہ نہ دیں۔ اللہ اپنے بندہ کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑتا۔ جس کا وکیل اور مددگار اللہ بن جائے اس کو کمزور سہاروں کی ضرورت نہیں رہتی اور قرآن کی آیت پڑھ کر سنائی۔

حسبنا اللہ و نعم الوکیل و نعم المولا و نعم النصیر.

نادیہ کو زندگی کی طرف واپس لانے کے لیے تقریباً روز ہی میں ملاقات کے لیے جاتی۔ ایک دن میں نے کہا چلیں ہم اپنے بیٹھنے کو فائدہ

مند کیوں نہ بنالیں۔ہم قرآن ترجمہ کے ساتھ شروع کرتے ہیں۔یوں ہم روزانہ قرآن باری باری پڑھتے اور پھر اس کے ترجمہ اور تفسیر کو بھی دیکھتے۔نادیہ کی طبیعت میں حیرت انگیز بہتری آرہی تھی۔جن وہمات اور خوف نے اس کا سکون اور نیند چھین رکھا تھا اور اس کے دن اور رات کا توازن خراب کر رکھا تھا۔اب اس میں اللہ کا رنگ شامل ہو رہا تھا نادیہ بہت دلجمعی سے قرآن پڑھتی اس کے مطالب پر غور کرتی۔قرآن کی برکت اور رحمت سے نادیہ اب دوائیوں کو تقریباً چھوڑ چکی تھی۔توہمات اور خوف کی بجائے اس کے دل میں سکون اور طمانیت نے رنگ جما دیا تھا۔اور آج جب کلاس ختم ہونے کے بعد آنکھیں بند کرتے ہوئے نادیہ نے یہ کہا کہ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں ماں کی ٹھنڈی اور پیار بھری آغوش میں آ گئی ہوں تو قرآن کی یہ آیت یاد کرتے ہوئے میری آنکھیں نم ہو گئیں۔

الابذکر اللہ تطمئن القلوب.

☆.....☆.....☆

بشریٰ راشد خان

سودُ بے سود

فون کی گھنٹی بجی۔ کوئی فون اٹھانے کو تیار ہی نہیں ہر کوئی اپنی مصروفیات میں الجھا ہوا ہے۔ بڑی مشکل سے راہداری سے گزرتے ہوئے ابراہیم نے ریسیور اٹھایا اور منہ کو لگاتے ہوئے بڑبڑایا کہ اتنی رات کو کس کا فون ہوسکتا ہے حالانکہ رات کے دس ہی تو بجے تھے لیکن ابراہیم صاحب اپنی عمر سے بڑی باتیں کیا کرتے تھے اور دادا کی نقل کرتے ہوئے ہمیشہ بڑے بڑے جملے بولا کرتے تھے۔ دوسری طرف سے بڑی ہلکی سی ہیلو کی آواز آئی اور کسی بڑے کو بلانے کیلئے کہا گیا جونہی بڑی بھابھی فون کے پاس آئیں انتہائی افسوسناک خبر سننے کو ملی چھوٹی پھوپھو کے بیٹے ادریس کی وفات ہوگئی ہے جو کہ چند دن پہلے ہاسپٹل سے آئے تھے چھوٹا سا ہارٹ اٹیک آیا تھا۔لیکن اب تو وہ گھر آ چکے تھے۔

پھوپھو دوسرے شہر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اپنے آبائی گھر میں رہتی تھیں جب کہ ان کے بیٹے اپنی کاروباری مصروفیات کی بنا پر شہر میں آباد تھے۔

گھر میں افراتفری مچ گئی کہ پتہ نہیں جب پھوپھو کو ان کے اکلوتے بیٹے کی وفات کا بتایا جائے گا تو ان کا کیا حال ہوگا وہ جوان بیٹے کی میت کیسے دیکھیں گی وہ کیسے گاؤں سے شہر تک کا سفر طے کریں گی۔

لیکن وہ سب کچھ ہوا جو کہ غیر ممکن نظر آتا تھا پھوپھو تک خبر پہنچی انہوں نے گاؤں سے شہر تک کا سفر بھی کیا اور جوان بیٹے کی میت کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا بھی۔ایک کہرام مچا ہوا تھا لیکن خدا کی مصلحتوں کے آگے سب بے بس تھے کہ آخر اس بوڑھی، بیوہ کی اکلوتی اولاد لینے میں اللہ کی کیا مصلحت تھی۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے چونکہ پھوپھو کا کوئی پوتا پوتی تو تھا نہیں اس لئے وہ جلد ہی اپنی بہو کو اس کے میکہ چھوڑ کر واپس اپنے آبائی گاؤں لوٹ گئیں اور ہر کوئی اپنی مصروفیات میں الجھ گیا۔

پھوپھو کی گاؤں میں زمینیں تھیں اور ان زمینوں کی اجناس سے جو رقم وصول ہوتی اس سے پھوپھو کی گزر اوقات ہو جاتی تھی۔ بیٹا چونکہ اپنی بیوی کے ساتھ شہر میں رہتا رہا تھا کہ اسے زمینوں اور اس کی آمدنی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بیٹے کے گزر جانے کے بعد پھوپھو اپنی پرانی دنیا میں لوٹ آئیں۔

دروازے پر اکثر دستک ہوتی کو نہ کوئی دروازے پر ہوتا کبھی کوئی مرد اور کبھی کوئی خاتون۔ ہاتھ میں کچھ رقم ہوتی یا تو وہ یہ رقم پھوپھو کو دے رہے ہوتے اور یا کبھی ان سے وصول کر رہے ہوتے اور پھوپھو بڑی توجہ کے ساتھ ہر چیز بڑے حساب کتاب سے لکھ رہی ہوتیں۔

میں اور ابو چونکہ پھوپھو کی خیریت دریافت کرنے گاؤں گئے ہوئے تھے اس لئے صحن میں کرسیاں لگائے میں گاؤں کی شام انجوائے کر رہی تھی۔

ابو کا ایک ہفتہ رہنے کا ارادہ تھا کہ اور بھی ضروری کام نپٹانے تھے۔ جو کہ اکثر گاؤں سے شہروں میں بسنے والوں کے Pending ہوتے ہیں جن کو وہ سال چھ مہینوں کے بعد جا کر نپٹاتے ہیں۔

ابو تو مصروف تھے اور میں سارا وقت پھوپھو کے ساتھ گزارتی تھی۔ جب میں نے اکثر یہ سلسلہ دیکھا کہ دروازے پر ہر روز کوئی نیا چہرہ نمودار ہوتا ہے۔کبھی عاجزی کے ساتھ رقم لوٹائی جا رہی ہے اور کبھی بڑی منت کے ساتھ مانگی جا رہی ہوتی۔

اور پھوپھو بڑے سلیقے کے ساتھ ڈیل کر رہی ہوتیں مجھے کچھ تعجب سا ہوا کہ آخر پھوپھو نے کونسا کاروبار شروع کیا ہوا ہے جس کیلئے ہر روز لوگ آتے جاتے ہیں لیکن پھوپھو سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ برا نہ مان جائیں۔

آخر ہماری واپسی کا دن آ گیا۔ صبح سویرے ہمیں نکلنا تھا رات

کافی گہری تھی ابو اور پھوپھو ایک کمرے میں کچھ بحث و مباحثہ میں مشغول تھے ابو چونکہ اپنی تینوں بہنوں سے چھوٹے تھے اس لئے اپنی بہن سے بڑے ادب سے بات کر رہے تھے اور پھوپھو کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ آپ یہ کام چھوڑ دیں لیکن وہ اس بات پر جمی ہوئی تھیں کہ یہ کام برا نہیں ہے۔ضرورت مند آتے ہیں میں تو ان کی مدد کرتی ہوں۔ ابو نے وضاحت کی کہ تمہارا بیٹا نماز، قرآن پڑھنے والا نیک سیرت بچہ تھا اس کو آپ کے ساتھ اس لئے رہنا گوارا نہ تھا کہ یہ کام ناجائز ہے۔

ساری زندگی آپ نے اس کی بات پر توجہ نہ دی وہ دنیا سے چلا گیا اب تو خدا کیلئے یہ کام چھوڑ دیں۔

قرآن پڑھا کریں اس کے معنوں پر توجہ دیں۔قرآن کی آیات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔اب آپ کا اس دنیا میں کچھ نہیں بچا۔اپنے اللہ کو کیا جواب دیں گی۔

ابو بلک بلک کر اپنی بہن کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن دوسری طرف ایک گہری خاموشی تھی۔

میں کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی لیکن یکا یک ابو اٹھے اور قرآن پاک اٹھالائے جس میں واضح الفاظ میں تحریر تھا۔

ترجمہ:''مگر جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو آخر سود ہی کے جیسی ہے۔ حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ (البقرہ ۲۷۵)

میرے تو اوسان خطا ہو گئے جب میں نے آیت کا ترجمہ سنا اوہ میرے خدایا تو کیا پھوپھو لوگوں سے سود وصول کرتی ہیں۔

اور میرے ابو نے جب سے ہم پھوپھو کے گھر آئے ہیں ان کے گھر سے ایک وقت کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ اکثر مصروفیات میں الجھے رہنے کا بہانہ کرتے ہوئے رشتہ داروں کے گھر سے کھانا کھایا کرتے تھے۔اور بہن کے گھر سے کھانا، کھانا حرام سمجھا جہاں سود کے پیسہ سے کھانا بنتا تھا۔

میری اتنی عمر تو نہ تھی لیکن میں بچہ بھی نہ تھی مجھے میرے ابو نے تنہا یہاں کیوں چھوڑ دیا مجھے اپنے آپ پر افسوس ہو رہا تھا۔

میں نے ابو کی بتائی ہوئی قرآن پاک کی آیت نکالی جس میں واضح طور پر لکھا ہوا تھا۔

ترجمہ: کہ جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کیلئے وہ سود خواری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے اور جو اس حکم کے بعد پھر اس حرکت کا اعادہ کرے وہ جہنمی ہے۔ جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے۔ اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔ اور اللہ کسی ناشکرے بدعمل کو پسند نہیں کرتا۔(البقرہ ۲۷۵)

اس لئے تو سود خور کی مال اور اولاد میں برکت نہیں ہوتی اب اللہ کی مصلحت میرے سامنے کھل گئی۔اصل میں اللہ اپنی گناہگار بندی کو توبہ کا ایک موقع دینا چاہتا تھا۔

پھر میری سمجھ سے یہ بات بھی باہر تھی کہ سود کا یہ سلسلہ شروع کیونکر ہوا۔کیا واقعی ایک ذرا سا منافع انسان کو اس طرح کر دیتا ہے کہ جیسے اس کو شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو کہ اسے حرام اور حلال کی تمیز ہی نہ رہے۔

بڑا سا سوالیہ نشان میری آنکھوں کے سامنے تھا اور ساتھ ہی اپنے باپ کی لاڈلی بہن کا چہرہ جو کہ جہنم کے راستے کی طرف بڑے انہماک سے چلی جا رہی تھیں، اور جن کو احساس بھی نہ تھا کہ یہ راستہ آگ کی طرف جا رہا ہے۔کاش وہ اپنی آنے والی دنیا بچالیں، موجودہ دنیا تو وہ اپنے ہاتھوں سے برباد کر ہی چکی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ ان کی لاعلمی تھی یا شیطان نے واقعی ان کو چھو کر باؤلا کر دیا تھا جس سے وہ حرام اور حلال کی تمیز نہیں کر پا رہی تھیں۔اس دن سے میں نے شدت سے یہ دعا مانگنی شروع کر دی کہ اللہ تعالیٰ پھوپھو کو شیطان کے اس راستے سے ہٹالے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ نے چاہا تو میری یہ دعا جلد ضرور پوری ہوگی۔

☆.....☆.....☆

بہترّ ایک تہترّ

ایک ایک کر کے اس کے بدن پہ چڑھے ہوئے تمام کپڑے سکڑنے لگے اور اس کا وجود چار سمتوں میں پھیلتا چلا گیا۔ اس کی رنگت ذلت کے خوف سے بے حد زرد ہو گئی۔ یرقانی رنگت..... اس کا سارا لہو نچڑ چکا تھا۔ وہ سارے الفاظ جو کئی دنوں سے دل ہی دل میں ترتیب دے رہا تھا، بھک سے اُڑ گئے۔ خالی دماغ ٹین کی طرح بجنے لگا۔

''ٹن ٹن۔ ٹناٹن ٹن.....''

محلے کی دیواروں پہ اُگی ہوئی سینکڑوں آنکھیں اس کے وجود پہ چیونٹیوں کی طرح رینگنے لگیں۔ اس کا سر جھکا تو اٹھنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ وہ سر اٹھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

''کاش زمین شق ہو جائے۔'' بددعا اس کے حلق میں پھنسی۔

یا کچھ ایسا ہو جائے کہ لوگوں کو اس کا وجود دکھائی دینا بند ہو جائے۔

لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ زمین برابر تھی اور وہ سب کے سامنے جیسے برہنہ کھڑا تھا۔

''نکل جا میرے گھر سے۔ ابھی اور اسی وقت نکل جا مردود.....''

اس کے باپ نے اسے بیچ بازار میں برہنہ ہی تو کر دیا تھا..... اسے..... یعنی ذوالقرنین عارف کو جو آئینے میں خود کو دیکھتا تھا تو لگتا کوئی ''نامحرم'' آنکھ اسے گھور رہی ہے۔ فوراً سامنے سے ہٹ جاتا..... وہ آج ذلت بھری دلدل میں دھنستا جا رہا تھا۔ کئی رنگ اور کئی شکلوں کے سوال اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ وہ ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح پہلو میں گرے ہوئے ہاتھوں کو اٹھا کر چہرے پہ رکھنے لگا۔

وہ سب سے چھپنا چاہتا تھا..... منظر سے غائب ہو جانا چاہتا تھا۔

لوگ دائرہ بنا کے کھڑے تھے..... تماش بیں..... چہ میگوئیاں.....

اسے تماش بیں دائروں سے ہمیشہ سے خوف آتا تھا۔ وہ تماشا بننے سے ڈرتا تھا لیکن آج اپنے ہی باپ کے ہاتھوں تماشا بنا ہوا تھا۔

محلے کے اکلوتے حاجی صاحب گالم گلوچ پہ اتر آئے۔

ان کے سانولے چہرے کے گرد جھاڑ جھنکار کی طرح لپٹی ہوئی داڑھی ہل ہل کے اسے ماں بہنوں کی ننگی گالیاں دے رہی تھی اور وہ لوگ کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے۔

حاجی صاحب مارے غضب کے ساری اخلاقیات بھول چکے تھے۔ وہ یہ بھی بھول چکے تھے کہ انہیں جمعے کی رات ''جو گالی دے وہ ہم سے نہیں'' پر پینتالیس منٹ کا سیرت افروز درس بھی دینا ہے۔

یاد رہا تو بس اتنا کہ ان کا بیٹا..... ہاں ان کا بیٹا.....

.....

حکم تبدیل ہوا اور تمام سر ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔

اس نے پہلے دائیں اور پھر بائیں جانب دیکھا، تا حد نگاہ قطاریں بندھی ہوئی تھیں۔ اتنے لوگ تھے کہ لگتا تھا جمع کا آخری ہندسہ بھی کم پڑ جائے گا۔ وہ ان کو جانتا ضرور تھا لیکن پہچانتا نہیں تھا۔ پھر وہ سب اس کے سامنے سے غائب ہو گئے۔ اس نے ایک بار، دو بار اور پھر سہ بار دیکھا لیکن اب اس کے سامنے کوئی بھی نہیں تھا۔

''کیا یہ کوئی خواب تھا؟'' اس نے چہرہ ٹٹولا تو اس کی آنکھیں نفی میں ہلیں۔

''سب لوگ کہاں گئے؟'' وہ بڑبڑایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ لوگ اپنے وقت پر آئیں گے۔ ابھی ان کے آنے کا وقت نہیں ہے۔'' اس کو عقب سے ایک بار عجب سی آواز سنائی دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہا لیکن دیکھ نہ سکا۔ اس کی گردن لوہے کی طرح تن گئی تھی۔

اسے اپنے کاندھوں پہ سخت دباؤ محسوس ہوا۔ اس کی آنکھیں دائیں طرف گھومیں تو سفید ملبوسات میں کچھ ہیولے سے نظر آئے۔ ''یہ کون لوگ ہیں؟'' جانے اس نے خود سے پوچھا تھا یا کسی اور سے۔ اسے کسی کے بولنے کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ ایک چبھتی ہوئی تیز آواز تھی۔ رعونت اور تنفر سے بھرپور..... کانوں کے پردے چھیدتی ..... اس کے دونوں کان سلگنے لگے۔ اس سے پہلے کہ اس کی برداشت کی حد ختم ہوتی۔ ایک اور آواز ابھری..... بارعب، ٹھہری اور مسحور کن.....

وہ اس آواز کو سنتے رہنا چاہتا تھا۔ وہ کس کی آواز تھی؟ وہ کون تھا؟ اور کیا کہہ رہا تھا۔

اس نے غور سے کان لگا کر سننے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ بس دو باتیں اسے سنائی دیں۔

تیرا راستہ.....

میرا راستہ.....

.....

صاف ستھری پختہ سڑک پر چلتے ہوئے اس نے کتنی بار آسمان کی طرف نظر اٹھائی۔ وہ انگلیوں پہ گن کے بتا سکتا تھا۔ ایک سو پینتیس بار..... کیوں؟ اس نے پھر اوپر کی طرف دیکھا۔ آسمان کو دیکھ کر اسے ابا کا سفید کُرتا یاد آیا جسے اماں کی بجائے شگونیل دیتی تھی تو کیسے ''ڈب کھڑبا'' ہو جاتا تھا۔ اماں کی صلواتیں اور شگو کی کھی کھی ایک ساتھ شروع ہوتی۔

آسمان کو جانے کس نے نیل دیا تھا آج ''ڈب کھڑبا'' ہو رہا تھا۔ کہیں نیل زیادہ آ گیا کہیں تھا ہی نہیں۔ لیکن وہ آسمان کو اماں کی نظر سے تو نہیں دیکھ رہا تھا۔

ایک سو سینتیس بار.....

وہ تھک کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا جو اچانک ہی راستے میں آ گیا تھا۔ اس نے دونوں گھٹنے ملا کر درخت سے ٹیک لگائی اور ان پر ٹھوڑی ٹکا کر بیٹھ گیا۔ دور تک سڑک پہ کوئی بھی نہیں تھا۔ ملیشیا کلر کی پکی سڑک پہ اس کی جگہ اب ہوا چل رہی تھی۔ وہ سویرے کافی دیر سے اٹھا تھا۔ نیند تو کیا آتی۔ اماں، ابا اور شگو کی یاد آنے لگی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے گھر چھوڑے۔ اس نے پھر انگلی پہ کچھ گنتی کی۔

''پورے پندرہ دن.....''

''ہائے اماں.....'' اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ ابا کی یاد آئی تو چہرے پہ تناؤ کی کیفیت ابھری۔

وہی تو تھے جن کی وجہ سے وہ آج سڑکیں ناپتا پھر رہا تھا۔ ویلا، نکما، کبھی اس مسجد میں کبھی اس مسجد میں..... بعض مسجدوں کے امام تو اسے مسافر جان کر ایک رات ٹھہرا ہی لیتے کہ وہ شکل سے ہی پکا سچا نمازی لگتا تھا۔ بے ریا، معصوم چہرہ..... رنگت کبھی سرخی مائل ہو جاتی، کبھی سفید برف سی۔ اس کی چمکتی ہوئی جلد دن میں کئی رنگ بدلتی۔ جیسے جیسے دن کے پہر تبدیل ہوتے اس کے چہرے کا رنگ بھی بدلتا جاتا لیکن آج کل چہرے ہی سب سے زیادہ دھوکہ دیتے ہیں۔ پیاز کی پرتوں کی طرح چہرے کھلتے ہیں..... ایک کے بعد دوسری پرت..... دوسری کے بعد تیسری..... اسی لئے تو بعض مساجد کی انتظامیہ نے رات کی نماز کے بعد اسے نکال باہر کیا کہ وہ مقامی آدمی نہیں تھا۔ وہ اس کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پہلی بار جب اس نے ہٹ دھرمی دکھانے کی کوشش کی کہ وہ مسافر ہے..... رات کے وقت کہاں جائے۔ مسجد میں ایک رات ہی تو بسر کرنی ہے۔ آخر وہ اللہ کا بندہ ہے..... اور مسجد..... اللہ کا گھر ہے۔ کسی کو کیا تکلیف ہے اس کے رہنے سے تو انہوں نے سکیورٹی گارڈ کو بلا لیا تھا جو اسے زبردستی کئی گلیاں آگے چھوڑ گیا۔ اللہ کا گھر کہیں پیچھے رہ گیا۔ اس رات وہ ایک فٹ پاتھ پر سویا۔ اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو آتے..... وہ تو غلیل سے پتھر نہیں مار سکتا تھا، کوئی تخریب کاری تو کیا کرتا۔ سکیورٹی گارڈ نے اس کی گدی اس زور سے پکڑی تھی کہ دو دن تک درد کرتی رہی۔ وہ کوئی ان پڑھ جاہل شخص نہیں تھا۔ بی اے پاس تھا۔ اس لئے کوشش کرتا تو کہیں نوکری مل ہی جاتی مگر ابا نے گھر سے نکالتے وقت کچھ بھی نہ دیا تھا اس کے ہاتھ..... اسناد تو ساری الماری کے دراز میں بند تھیں۔ نوکری کس برتے پر ملتی..... اور اس کی جوانی بھی منہ زور..... مارے طیش کے کاندھے پر لپٹی چادر کو زوردار جھٹکا دے کر سیدھا کیا اور

گھر کیا محلّہ ہی چھوڑ آیا۔ یکے بعد دیگرے کئی محلے بدلے مگر جیب میں موجود چند سو روپوں سے تو گزارہ نہیں ہونا تھا۔ اس نے کیسے دانتوں سے پکڑ کر یہ روپے دال روٹی خرچ کیے وہی جانتا تھا جس کی شاہ خرچیاں اتنی تھیں کہ جیب ہر وقت نوٹوں سے بھری رہتی تھی اور اب اس کی جیب میں کل چھیاسی روپے تھے۔

وہ پھر آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ نیل سیاہی میں بدل رہا تھا کچھ دیر میں مکمل تاریکی چھا جاتی۔ اس نے کچھ سوچ بچار کی، پھر وہیں چادر بچھا کر اور بازو کا تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ بہت دیر بعد نیند آئے گی لیکن اس کے پاس فی الحال کرنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔ کبھی کبھار انسان اتنا بیکار ہو جاتا ہے کہ اپنی ہی بیکاری پہ تاؤ آتا رہتا ہے۔ اپنا وجود کاٹھ کباڑ سے زیادہ نہیں لگتا..... کاٹھ کباڑ کی تو پھر بھی کچھ قیمت ہوتی ہے اور انسان کی؟؟؟

وہ گنتی کا شوقین لگتا تھا۔ اس لئے لیٹ کر تارے گننے لگا۔

ستر اکہتر بہتر.....تہتر.....

گنتی جاری تھی لیکن پھر اسے نیند آ گئی۔

.....

اگلی صبح بھی اسے کسی نے نہیں جگایا۔ خود ہی آنکھ کھلی۔ وہ کتنی ہی دیر آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ سبک رفتاری سے چلتی بادِ نسیم اس کے رخسار تھپتھپا کر اسے جگا رہی تھی۔ وہ غنودگی کی حالت میں مسکرایا۔ اسے لگا، اس کے پاس اس کی بیوی بیٹھی ہے۔

''بیوی'' اس نے پٹ سے آنکھیں کھول کر اوپر دیکھا۔ اوپر پھر آسمان تھا اور اس کی نیلاہٹیں۔ اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ گردن میں ابھی بھی درد ہو رہا تھا۔ وہ ہلکے ہلکے دبانے لگا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ فاصلے پہ ایک آوارہ کتا اس کی طرف رخ کیے زبان نکالے کھڑا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور تیز تیز چلنے لگا۔ اس کی ساری سستی پل میں ہوا ہو گئی۔ کتا بے وجہ ہی بھونکا۔ اس کے قدموں میں مزید تیزی آ گئی۔ کتا وہیں کھڑا بھونکتا رہا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا سڑک کے نکڑ پر پہنچ گیا۔ اس کے سامنے اب دورویہ مکانات کی شروعات تھی۔ کسی نئے محلے کا آغاز۔

وہ کوئی چائے خانہ ڈھونڈنے کے لئے مکانوں کی قطاروں میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے محلے کی جامع مسجد ڈھونڈنی تھی۔

کچھ دور جا کر ایک چائے خانہ تو نظر آ گیا لیکن ساتھ ہی وہ حساب کتاب بھی کرنے لگا کہ کتنے کا بل بنے گا۔ انہی سوچوں میں غلطاں وہ پلاسٹک کی ایک میلی سی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا جس کے سامنے جالی دار میز پہ پلاسٹک کا جگ اور گلاس رکھا تھا۔ اسے ایک دم پیاس کی شدت کا احساس ہوا۔ دو گلاس بھر بھر کے پیٹ میں انڈیلنے کے بعد اس نے ایک طرف لگا واش بیسن دیکھا تو اٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔ گول شیشے میں چہرہ صاف دکھائی نہ دیتا تھا، پھر اسے اپنی شکل تو نظر آ رہی تھی۔

بے حد تھکا ہوا۔ پر مژدہ چہرہ
اس کی سرخ سفید رنگت پیلی پھٹک ہو رہی تھی
بے ترتیب.....الجھے ہوئے بال
بڑھی ہوئی شیو
اور کئی جگہ سے مسکا ہوا سوٹ
کتنے دن سے اس نے یہ سوٹ پہن رکھا تھا۔

افففف.....اسے سوچ کر ہی ابکائی آنے لگی۔ وہ تو روز کپڑے بدلتا تھا۔ اس کا دل چاہا دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ آنکھوں کو زور سے میچتے ہوئے وہ واپس کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ خستہ پراٹھوں کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرا کر بھوک کا ظالم احساس جگا رہی تھی لیکن اس نے ایک کپ چائے کا آرڈر دیا جس پر ''چھوٹے'' نے چونک کر اسے دیکھا، پھر سر ہلاتا چلا گیا۔

اطراف میں بیٹھے کئی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کوئی اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ کن اکھیوں سے سب کو دیکھ رہا تھا کہ ایک لمبا تڑنگا صحت مند سا آدمی اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی ہانک لگائی۔

''ڈبل پراٹھے، انڈہ فل فرائی، دودھ پتی۔''

وہ اپنی جگہ کچھ سمٹ سا گیا۔ مقابل نے اس پہ نظریں ڈال کر غور سے دیکھا اور پھر پوچھا ''مسافر ہو؟''

''جی۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کہاں سے آئے ہو؟'' اس کا لہجہ دبنگ تھا۔ وہ خود بخود جواب دینے پر مجبور ہو گیا۔

''وہ تو کافی دور ہے یہاں سے..... کسی کام سے آئے ہو؟''

''جی..... کام کی تلاش ہے۔ آپ کوئی مدد کر سکیں تو.....'' اس کے دماغ نے فوراً کام کیا۔

''کام.....'' اب کے اس نے غور سے دیکھا۔ سر سے پاؤں تک۔ وہ مزید اپنے آپ میں سمٹ گیا۔

اس کا نام سیف علی تھا۔ اسکا اسی محلے میں خوب چلتا ہوا جنرل اسٹور تھا۔ اس کی فیملی کسی گاؤں میں رہتی تھی اور خود یہاں دوستوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے ذوالقرنین کو اپنے اسٹور پہ سیل مین کے طور پر رکھا لیا تھا۔ وہ کوئی خدا ترس آدمی نہیں تھا لیکن جانے کیوں اسے ذوالقرنین کی شخصیت میں اسرار سا نظر آیا۔ وہ ڈرا سہما بیس، بائیس سالہ نوجوان بے حد خوش شکل دکھائی دیتا تھا۔ گو کہ جس حال میں وہ اسے ملا وہ کوئی تھکا ہارا مزدور لگ رہا تھا جو اپنی دیہاڑی کر کے واپس آیا ہو مگر جب اس نے نہا دھو کر سیف علی کے ہی ایک دوست جو قدبت میں اسی کے برابر تھا، کا کریم کلر کا سوٹ پہنا تو سیف علی نے اس کی وجاہت کی بے حد تعریف کی تھی۔

''کیا تم شادی شدہ ہو؟'' اس کی نجی زندگی کے بارے میں سیف علی نے پہلا سوال یہی کیا۔

''نہیں۔'' وہ جھینپ گیا اور نفی میں سر ہلا کر انگشت شہادت سے انگوٹھے کا ناخن کھرچنے لگا۔

''منگنی ونگنی؟''

''نہیں.....''

''چلو خیر ہو جائے گی شادی بھی..... کتنے بہن بھائی ہو، ابا کیا کرتے ہیں؟'' وہ میٹرس پہ نیم دراز اب باقاعدہ سوال جواب کرنے لگا۔

''دو چھوٹے بھائی اور دو بہنیں..... میں سب سے بڑا ہوں۔ ابا..... حکیم ہیں۔ مطب چلاتے ہیں اپنا اور حافظ قرآن ہیں تو مسجد میں امامت وغیرہ بھی کرواتے ہیں اور حاجی.....'' کچھ جھجک کر بتاتے بتاتے وہ خاموش ہو گیا۔

''اچھا..... خیر..... تم آرام کرو..... باقی باتیں رات کو ہوں گی..... جب تک وہ چاروں بھی آ جائیں گے۔''

.....

باقی چاروں بھی اچھے مزاج کے حامل تھے۔ غضنفر جسے وہ سب صوفی صاحب کہتے تھے، کچھ خاموش طبع تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ نمازی پرہیزی..... وہ سب اس کا تعارف کرواتے ہوئے اس پہ مسلسل چوٹ کر رہے تھے لیکن وہ خاموشی سے مسکراتا رہا۔ پھر یہ چاروں تو تاش کی گڈیاں لے کر بیٹھ گئے۔ غضنفر نے عشاء کی نماز پڑھنی تھی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ انہوں نے ذوالقرنین کو بھی بازی لگانے کی دعوت دی لیکن وہ نا بلد تھا، اس لیے معذرت کر لی اور پھر کچھ دیر انہیں دیکھتے رہنے کے بعد وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گیا جہاں غضنفر کو دیکھ کر اسے ابا یاد آ گئے۔ وہ بھی پنج وقت کے نمازی بلکہ کبھی کبھار تہجد گزار بھی تھے۔ انہی کی سختی کی وجہ سے وہ سب بہن بھائی بھی نماز کے عادی تھے اور اب تو ذوالقرنین نے پچھلے دو ہفتوں سے گنتی کے سجدے ہی کیے تھے۔ وہ موڑھے پر بیٹھ کر غضنفر کو دیکھنے لگا۔ رکوع، سجدہ، تشہد، سجدہ..... قیام..... وہ اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

''آخری عمر میں ہمارے سر پہ خاک ڈالے گا نامراد۔'' ابا اس کے کانوں میں گرجنے لگے۔

''کیا یہی تربیت کی ہے ہم نے تیری کہ آج تو ہمارے سامنے زبان چلائے..... کاٹ کے رکھ دوں گا یہ زبان..... کفر بکتا ہے بد ذات۔'' وہ غصے سے کانپنے لگے تھے۔

''اے ہئے..... بچہ ہے۔ میں سمجھا دوں گی۔'' اماں نے سیز فائر کی کوشش کی۔

''یہ بچہ ہے..... شرم تو نہیں آتی اسے بچہ کہتے ہوئے۔ داڑھی مونچھ والا بچہ..... اونٹ جتنا قد..... یہ بچہ نظر آتا ہے تمہیں احمق عورت۔'' ان کا رخ اماں کی طرف ہو گیا۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی

کھڑکی سے جھانک رہے تھے۔شگو کی آنکھیں پانیوں سے بھری ہوئی تھیں اور وہ کفر بولنے پر آمادہ۔

''آپ کے پاس کیا گارنٹی ہے ابا کہ آپ ہی صحیح ہیں اور باقی سب غلط.....آپ کو کسی نے بتایا ہے؟ کس نے گارنٹی.....''

''بکواس بند کر مردود.....'' ابا پوری قوت سے دھاڑے۔

''کیا تمہیں بھی نماز پڑھنی ہے؟'' غضنفر نے اسے ماضی کے عذاب سے حال میں لا پٹخا۔وہ نماز پڑھ چکا تھا۔اس کی آواز پر وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔پھر آہستگی سے بولا۔

''میں.....میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔''

.....

''ابے اس کی نماز روزے پہ نہ جائیو.....مشرک آدمی ہے.....پکا مشرک..... بلکہ ہم تو اسے جمعراتی بھی کہتے ہیں۔ ہر جمعرات کو دیئے جلاتا ہے۔گیارہویں شریف، نذر نیاز، درگاہوں پہ حاضری..... پیری فقیری.....تعویذ گنڈے۔ ہر کام ہی شرکیہ ہے اس کا.....'' صغیر اس دن گھر پہ ہی تھا۔اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ذوالقرنین تو روز دوپہر کو آجاتا۔دو گھنٹے آرام کے بعد پھر تازہ دم ہو کر دکان پر چلا جاتا۔سیف علی اس کے کام سے بہت خوش تھا۔وہ محنتی لڑکا تھا۔دیانتدار اور تھا بھی پھرتیلا.....آج وہ دوپہر کو آیا تو صغیر بھی موجود تھا۔گو کہ اس کی طبیعت خراب تھی لیکن ذوالقرنین کے آنے سے پہلے وہ کوئی انگلش فلم دیکھ رہا تھا۔ مڈل پاس صغیر کو انگلش مووی کی تو کیا سمجھ آتی پر چند لمحوں کے مصالے دار سین کی خاطر وہ ڈھائی تین گھنٹے کی فلم روزانہ دیکھتا۔اسے فکر دامن گیر رہتی کہ کہیں اس کی گنہگار آنکھیں کوئی ''مطلوبہ'' سین دیکھنے سے محروم نہ رہ جائیں۔فلم دیکھنے کے بعد وہ زیادہ تر اللہ رسول، آخرت اور جہنم کی باتیں کیا کرتا۔ ذوالقرنین کو اس کی سمجھ نہیں آتی تھی بلکہ اصل میں تو انہیں پانچوں کی سمجھ نہیں آئی تھی ابھی تک۔

''میں ان لوگوں جیسا کیوں نہیں ہوں..... کیا میں اسی دنیا میں نہیں رہتا۔'' کبھی کبھار تو وہ خود سے عاجز آجاتا اور اب وہ صغیر کے پاس آیا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔پھر ایک آنکھ دبا کر بولا۔

''آجا مولوی کی اولاد..... تجھے جنت کی حوریں دکھاؤں۔''

ذوالقرنین نے حور کی طرف سے کمر کر لی اور معذرت کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔اس کے لیٹنے کے کچھ دیر بعد صغیر بھی ٹی وی بند کر کے اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جب اس نے غضنفر کی تعریف کی تو صغیر نے ٹوک دیا۔

''مشرک.....'' اس کی سوئی لفظ مشرک پر اٹک گئی۔

''ہاں اور نہیں تو کیا.....اس کے پیچھے نہ لگ جانا میرے بھائی۔ تجھے بھی پیری فقیری کے چکر میں پھنسا دے گا۔''

صغیر ہنس کر بولا مگر اسے ذرا ہنسی نہیں آئی۔

''آپ کا مسلک کیا ہے؟''

''میرا۔'' وہ اور زور سے ہنسا۔''میرا کوئی مسلک نہیں۔میں کون سا بڑا دیندار ہوں۔'' اس کا دل چاہا پوچھے تو فتویٰ کیوں دے رہے ہیں مگر چپ رہا۔

''ہاں پر شرک نہیں کرتا.....شرک سب سے بڑا گناہ ہے۔تمہیں پتہ ہی ہوگا۔''

''جی۔''

''تم دیندار گھرانے سے ہو۔ایک مولوی کے بیٹے.....لیکن کچھ بھولے بادشاہ بھی ہو۔اس لیے غضنفر کے گُن گا رہے ہو۔ ہے تو یہ پانچ وقت کا نمازی مگر..... خیر.....میں تمہیں متنفر نہیں کر رہا بلکہ ایک طرح سے خبردار ہی کر رہا ہوں۔''

''جی''

ایسے فتوے تو اس کے ابا بھی لگاتے رہتے تھے۔اس کا معاملہ بھی عجیب ہی تھا۔گھر کا ماحول کچھ ایسا تھا کہ وہ مذہب کی طرف بچپن ہی سے راغب تھا اور بحث مباحثے کا شوقین بھی۔فرقہ واریت کو لے کر اس کی کئی جھڑپیں ہو چکی تھیں محلے داروں سے لیکن کمسنی کا دور تھا سو بات رفع دفع ہو جاتی۔اسے لگتا تھا بس وہی حق پر ہے۔اس کا گھرانہ ہی جنتی ہے۔وہ لوگ ہی راہ راست پر ہیں، باقی سب بھٹکے ہوئے ہیں۔

لیکن پھر اس کی کالج میں شہباز حسن سے دوستی ہوئی تو پہلے پہل

اسے شہباز کے مسلک کے بارے میں خبر نہیں ہو سکی۔ وہ بہت سلجھے ہوئے ذہن کا مالک لگتا تھا۔اس کی باتیں دلائل سے بھرپور ہوتیں۔وہ مقابل کو تسخیر کر لینے کے فن سے بخوبی آگاہ تھا۔ذوالقرنین کو خبر ہی نہ ہو سکی کہ کب وہ شہباز حسن کی ذات کا اس قدر اسیر ہوتا چلا گیا کہ اس کی آنکھوں سے دیکھنے اور اس کے کانوں سے سننے لگا۔گھر والے اس کی ذات،نظریات وخیالات میں تبدیلیاں تو دیکھ رہے تھے لیکن اس کے ابا کے ڈر سے خاموش تھے۔شگو نے اسے کئی بار سمجھایا مگر وہ اسے لاجواب کر دیتا۔شہباز حسن نے اسے بہت ساری کتابیں پڑھنے کے لئے۔اس کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔آج تک تو وہ ابا کی دیکھا دیکھی زبانی کلامی تقریریں کرتا تھا جو ابا نے بتایا وہی آگے بتا دیا۔گھر میں جو اتنی ساری ابا کی الماری میں اسلامی کتابیں اور احادیث کی کتب رکھی ہوئی تھیں،وہ انہی کے قبضے میں رہتی تھیں۔وہ سب بہن بھائی ابا کے ڈر سے ہاتھ نہ لگاتے کہیں قیمتی کتابیں خراب نہ ہو جائیں۔وہ وہیں پڑی رہیں اوز اس نے شہباز کی دی ہوئی ساری کتابیں پڑھ ڈالیں اور جس دن اس نے اعلان کیا کہ شہباز حسن کا مسلک صحیح ہے،وہ راہ راست پر ہے۔اسی دن ابا نے اسے کافر قرار دے کر گھر سے نکال دیا۔

''شہباز حسن صحیح ہے اور اس کا باپ غلط..... اس کا مسلک غلط.....''

چٹاخ.....چٹاخ.....چٹاخ.....

اس کے باپ کا ہاتھ تین بار اٹھا تھا اور اس کے چہرے پر ان گنت لکریں چھوڑ گیا۔اس کے کچھ کہنے کے لئے وا ہوتے لب ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے تھے اور وہ وہیں حیرت سے بت بن گیا تھا۔

''تو کافر ہو گیا ہے کافر.....خبیث، ناہنجار.....ذلیل.....تیرا کوئی تعلق نہیں آج سے ہمارے ساتھ.....مر گیا تو ہمارے لئے.....کفر بکتا ہے بے غیرت.....'' اس کے باپ کا قدرے بھاری وجود شدید اشتعال کے باعث ادھر ادھر ڈولنے لگا۔کف اڑاتے ہوئے وہ اسے زہرناک نظروں سے گھور رہے تھے۔

اس نے سوچا تو جھرجھری سی آ گئی۔

خوب تماشا لگا تھا اس روز اس کا.....خوب ہنسی اڑائی ہو گی محلے والوں نے۔وہ جانتا تھا۔

وہ چاہتا تو اس روز شہباز حسن کے پاس جا سکتا تھا لیکن ان دنوں تو یونیورسٹی میں سے بھی چھٹیاں تھیں اور شہباز حسن کچھ دن کے لئے لاہور چلا گیا تھا۔کچھ اس کی طبیعت ایسی تھی کہ اپنی پریشانیوں میں دوسروں کو شریک کرنا گناہ سمجھتا تھا۔ان دنوں بس شہباز سے ہی اس کی دوستی تھی اور وہ بھی یہاں نہیں تھا۔وہ ادھر ادھر بھٹکتا رہا اور پھر یہاں آ گیا۔جہاں پانچ مختلف مزاج اور فطرت کے لوگ ایک ساتھ رہتے تھے۔تین کا مسلک تو ایک ہی تھا،دو کے الگ تھے اور اسے تو ان دنوں سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ جائے تو کہاں جائے۔کون سا مسلک اختیار کرے؟ کون سا راستہ سیدھا اور سچا.....ہر راستہ ہی بظاہر ٹھیک بھی تھا اور غلط بھی۔وہ کئی دن سوچتا رہا پھر ''مسلمان'' ہوا۔اور اب صغیر کہہ رہا تھا کہ وہ مشرک ہو جائے گا۔اس کا دماغ گھومنے لگا۔''مشرک'' کا لفظ اس کے حلق میں پھنس گیا۔اسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔اس نے اوپر دیکھنا چاہا تو اس کے اور آسمان کے بیچ چھت حائل ہو گئی۔

.....

ایک ماہ سات دن گذر گئے اسے اماں،شگو،حذیقہ،نرمین اور حاذق کی شکل دیکھے۔ابا بھی کبھی کبھار یاد آتے مگر ان کی سخت مزاجی، اکھڑ لہجہ،دبنگ آواز اس یاد پر حاوی ہو جاتی اور تصویر معدوم ہو کر نقطے کی شکل اختیار کر لیتی۔پھر نقطہ بھی غائب ہو جاتا۔

وہ پھر سے پانچ وقت کا نمازی بن گیا۔جب وقت ملتا قرآن بھی کھول لیتا اور ترجمے پر غور کرتا۔غضنفر کے سوا باقی چاروں اس کا مذاق اڑاتے کہ اس کی عمر کے لڑکے بالے عشق وعاشقی کے چکروں میں پڑے رہتے ہیں اور اس پر ابھی سے بزرگیت نے ہلہ بول رکھا ہے۔وہ اکثر تو ہنس کر جواب دے دیتا یا پھر خاموش ہو جاتا۔یہ پانچ لوگ تھے مختلف رنگ،نسل،زبان اور علاقوں کے لیکن ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کی آپس میں گہری دوستی بھی تھی۔وہ بھی ان میں انہی کی طرح گھلنا ملنا چاہتا تھا لیکن اس کی ازلی جھجک اسے اپنے خول میں سمیٹ دیتی۔وہ ان کی

طرف بڑھتے بڑھتے رک جاتا اور پھر اپنی ذات میں گم ہو جاتا۔ وہ اسے پکارتے، بلاتے، چھیڑ چھاڑ کرتے مگر ذوالقرنین عارف **صُمّ بُکّمٌ** جاتا۔

''تمہیں گھر کا چکر لگانا ہے تو لگا آؤ۔ فون پر تو بات ہوتی ہی ہوگی تمہاری۔ پھر بھی اتنا دور بھی نہیں ہے تمہارا گھر۔ اس جمعرات کو چلے جاؤ دو دن کے لئے۔'' سیف علی کو اس کی ذات کی اداسی ان دنوں کچھ زیادہ ہی کھل رہی تھی۔

''گھر......'' وہ جو خالی خالی نظروں سے دیوار کو تک رہا تھا، چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر فوراً سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

''جی......'' آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اب وہ انہیں کیا بتاتا کہ موبائل تو اس کے پاس تھا لیکن اسے ڈر تھا کہ اماں ضرور ہی فون کروادیں گی تو اس نے سم نکال دی تھی اور کچھ دن پہلے نئی سم تو خرید کر ڈال لی تھی لیکن اسے کسی کا نمبر یاد نہیں تھا۔ سارے نمبر پہلی سم میں تھے۔ اسے خوف لاحق تھا کہ جیسے ہی اس نے پہلی سم ڈالی گھر سے فون آجائے گا۔ وہ کس سے فرار چاہتا تھا؟ ابا سے، گھر والوں سے یا خود سے؟

جمعرات کی شام وہ ویگن میں سوار ہو کر اپنے محلے چلا آیا۔ سب سے پہلے نکڑ والے نذیر احمد کی نظر اس پر پڑی۔

''ارے ذوالقرنین! تم کب آئے گاؤں سے ...... اس بار تو زیادہ ہی دن لگا دیئے۔ اب خیر سے کیسی طبیعت ہے تمہارے ماموں کی۔ ماں تو تمہاری آپ مریضہ ہے بیچاری۔ وہ کیسے جاتی، تمہیں ہی بھیجنا تھا۔'' وہ جو ایک دم انہیں سامنے دیکھ کر شش و پنج میں مبتلا ہو گیا تھا کہ کیا کہے گا۔ ایک طمانیت بھری لہر اس کے بدن میں سرایت کر گئی۔ پہلی بار اسے نذیر چاچا کے ایک دم ہی آٹھ دس سوال ایک ساتھ پوچھ لینے والی عادت اچھی لگی اور شاید انہیں اس دن والے ''تماشے'' کا علم نہیں تھا...... یا شاید بھول بھال گئے تھے...... مگر لوگ ایسے واقعات کب بھولتے ہیں۔

''جی۔ تھوڑی دیر ہوئی، بہتر ہے۔'' وہ جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ نذیر چاچا کو بھی جلدی تھی، اس لئے آگے بڑھ گئے۔ وہ سبز رنگ کے گیٹ کے سامنے آرکا اور ہلکے سے دستک دی۔

''کون؟'' کچھ دیر بعد شگو کی آواز سنائی دی۔

''میں ہوں شگو...... گیٹ کھولو۔''

''نین......'' شگو کی حیرت بھری آواز ابھری۔ پھر ایک چھناکے کی آواز آئی۔ شاید اس کے ہاتھ سے کچھ گرا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کے سینے سے لگی رو رہی تھی۔

''تم کہاں چلے گئے۔ کتنا تلاش کیا ہم نے تمہیں اپنے طور پر۔ ابا تو......''

''اوہو۔ رو کیوں رہی ہو پگلی۔ زندہ سلامت واپس آگیا ہوں اس لئے؟'' بہن کو سامنے دیکھ کر اس کی شرارتی رگ پھڑ کی۔ ''تمہاری بکواس آتے ہی شروع ہوگئی۔'' اسے یکدم غصہ آیا، پھر اس کی مسکراہٹ دیکھ کر بولی۔ ''آؤ اندر...... اماں تو اس دن سے بستر سے لگی ہیں۔'' وہ گیٹ بند کرنے لگی۔ ذوالقرنین نے اندر آکر گھر پہ طائرانہ نظر دوڑائی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔

''باقی سب کہاں ہیں؟'' اسے خاموشی محسوس ہوئی۔

''کون ہے شگو؟'' اماں کی نحیف آواز......

''اماں......'' وہ بے تابی سے آگے بڑھا مگر...... صحن میں رکھے ابا کے جوتوں پر نظر پڑ گئی۔ اس کے بعد ان کی آواز بھی آ گئی۔ ''اندر آنے کی ضرورت نہیں ہے میاں...... یہ مسلمانوں کا گھر ہے۔'' وہی پتھریلی آواز...... وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔

''شگو اسے کہہ دو، چلا جائے...... ہمارے لئے مر چکا ہے یہ...... ہم نے اسی دن فاتحہ پڑھ لی تھی اس پر جس روز یہ ساری دنیا کے سامنے تماشا بنا کر گیا تھا ہمیں۔'' وہ سخت خفا تھے۔

''تماشا...... میں؟'' اس کے اندر احتجاجی لہر ابھر کر معدوم ہوگئی۔ پھر آہستگی سے بولا۔

''میں نے وہ مسلک چھوڑ دیا ہے ابا......''

''اچھا...... اب کون سا نیا دین اختیار کر لیا ہے خیر سے۔'' وہ طنز کرنے سے باز نہ آئے۔

''میں اماں سے مل لوں۔'' اس کے ماتھے پہ بل پڑا......

''یاد آ گئی تمہیں اب ماں کی ..... بڑی جلدی خیال آ گیا۔'' ابا باہر مسلسل بول رہے تھے اور اندر ماں اواس کے آنسو آپس میں مل رہے تھے۔

.....

شگو نے بتایا کہ شہباز حسن اس کا کئی بار پوچھنے آیا تھا۔

وہ اب اس سے کبھی بھی ملنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اسے پھر اپنی طرف موڑ لے گا اور پھر سے ابا اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیں گے لیکن وہ اب کسی کی طرف مڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کسی طرف جانا نہیں چاہتا تھا۔ ہر مسلک کی اپنی دکانداری تھی، ہر کوئی اپنی دکان چمکاتا ..... یہاں آ جاؤ، ادھر مال اچھا ہے۔ جنت کا ٹکٹ ادھر سے ملے گا۔ دوسرے سارے مشرک ہیں، کافر ہیں ..... بس اپنے آپ کو درست اور دوسرے کو غلط کہنا۔ وہ بچپن سے یہی سنتا اور دیکھتا آیا تھا۔ سنی، بریلوی، دیوبندی، شیعہ، وہابی، اہل حدیث، حنبلی، شافعی، مالکی، اسماعیلی، آغا خان الا بلا ..... فلاں فلاں ..... ہرے پگڑ، سیاہ عمامے، سفید کُرتے، مسواکیں، جالی دار ٹوپیاں، تسبیحات، منکے، مصلے، اور ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں۔ اس کا دماغ سن ہونے لگتا، اب اس موضوع پہ کوئی کیا بات سنے۔

رات کو جب ابا نے اپنی تسلی کے لئے اس سے پوچھا کہ وہ اب بھی انہی کے مسلک پر ہے یا اور کسی کے پر؟ تو وہ صاف صاف بول گیا۔

''ابا..... ہمارے نبی کریمؐ کے مطابق ان کی امت میں تہتر فرقے ہوں گے اور صرف ایک فرقہ جنت میں جائے گا۔ وہ کون سا فرقہ ہوگا؟ کیا ہم میں سے کوئی جانتا ہے۔ میں اپنے طور پر ریسرچ کر رہا ہوں ابا..... میں ہر وہ کتاب پڑھوں گا جو مجھے دین اسلام کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دے گی ..... یہ میری ذمہ داری ہے ابا۔ آپ لوگوں کی نہیں ہے۔ آپ نے مجھے پڑھا لکھا دیا، اب میں جو راستہ اختیار کروں گا اپنے طور پر مکمل تحقیق کرنے کے بعد ہی اختیار کروں گا۔ ہمارے باپ دادا کے دین نے تو ہمیں بس تفرقہ بازی ہی سکھائی ہے۔ بس ہمارا فرقہ اچھا ہے۔ جنتی ہے۔ باقی سب جہنمی ..... اور پھر ہم کہتے ہیں کہ قرآن میں صاف لکھا ہے کہ تفرقہ بازی میں نہ پڑو۔ آخر ان تہتر فرقوں میں سے ایک فرقہ تو جنتی ہے ہی، وہ کون سا ہے؟ اس سوال کا جواب میں خود تلاش کروں گا۔''

''تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' ابا اس کی تقریر سے ذرا متاثر نہ ہوئے۔ وہ پھر سے بولنے لگے مگر اس بار وہ چپ رہا اور یہ نہ پوچھا کہ آپ کو کس نے گارنٹی دی؟

گارنٹیوں والا دین کون سا دین ہے؟

.....

اور اگلے دن وہ جمعہ کی نماز ادا کرنے قریبی جامع مسجد گیا۔ ابا اپنے مسلک والی مسجد میں ہی نماز ادا کرتے تھے جو کچھ دور تھی۔ وہ اور اس کے چھوٹے بھائی آج بھی وہیں گئے لیکن وہ قریبی مسجد میں ہی چلا آیا۔ مسجدوں کا کون سا فرقہ ہوتا ہے۔

اور عین سجدے کے دوران جب اس جامع مسجد کے تمام نمازی سجدے کی حالت میں تھے۔ ایک زوردار دھماکے کی آواز آئی.....

سب سے پہلے چھت زمین بوس ہوئی۔

مینارے ٹوٹے

اور ستون نمازیوں پر گرنے لگے

مٹی، دھول، پتھر، کنکریاں، مصلے، ٹوپیاں، قرآن کے اوراق اور لت پت نمازی چیخ و پکار، آہ و بکا..... خون ہی خون.....

قیامت کا منظر تھا۔

بیسیوں نمازی پل بھر میں لاشوں میں بدل گئے۔ ایک پھول کی طرح کھلی ہوئی لاش ذوالقرنین عارف کی بھی تھی۔ اس کی کھلی آنکھیں حیرت سے آسمان کو تک رہی تھیں۔ ان میں صاف لکھا نظر آ رہا تھا۔

بہتر..... ایک..... تہتر

(سہ ماہی فنون)

☆.....☆.....☆.....☆

ڈاکٹر نبیہہ حسن کے ساتھ پانچ سال

میں نے ایم بی بی ایس 1963 میں کیا پھر اس کے بعد اکتوبر 1979ء تک فاطمہ جناح میڈیکل کالج کے گیٹ سے اندر نہ گئی۔ 1979 میں گورنمنٹ نے ہر میڈیکل کالج میں فورنزک میڈیسن کی سیٹیں شروع کیں اور دوسرے ڈیپارٹمنٹس کی طرح یہ بھی ایک باقاعدہ ڈیپارٹمنٹ بن گیا پی ایم ڈی سی (Pakistan Medical Dental Council) نے باقی تمام کالجوں میں تو پروفیسر، ایسوسی ایٹ، اسسٹنٹ، ڈیمنسٹریٹر، پیرا میڈیکل سٹاف سب کی پوسٹیں رکھیں مگر فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں ایک اسسٹنٹ پروفیسر اور ایک ڈیمنسٹریٹر کی پوسٹ تھی۔

میں اُن دنوں کیمیکل ایگزیمنر لیبارٹری میں کام کر رہی تھی۔ کام کے دوران میں ہی میں نے DMJ (Diploma in Forensic Medicin) کر لیا۔ سب نے مشورہ دیا کہ عورتوں کا کالج ہے لاہور ہی میں ہے تمام نوکری لاہور میں ہی کرلوگی اس لئے درخواست دے دو۔ خیال تو تھا کہ ڈیپوٹیشن مل جائے گی مگر انٹرویو لینے والوں نے کہا کہ کیونکہ یہ گورنمنٹ کا ادارہ نہیں (اُن دنوں کالج گورننگ باڈی چلا رہی تھی) اس لئے استعفیٰ ہی دینا پڑے گا۔ مشورے کے بعد استعفیٰ دیا اور جوائن کرلیا۔

چارج رپورٹ بھر کر پرنسپل کے پاس گئی پوچھا کہ بیٹھنا کہاں ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس جگہ نہیں تم ماہ لقا سے کمرہ لے لو اس کے پاس بہت کمرے ہیں۔ ماہ لقا میری کلاس فیلو رہ چکی تھی کمیونیٹی میڈیسن میں اسسٹنٹ پروفیسر تھی دل کی بھی کھلی تھی اس نے فوراً ایک عدد کمرہ دے دیا جس کا حدود اربعہ 8X8 تھا ایک چھوٹا سا میز دو کرسیاں ایک لوہے کی الماری۔ کرسیاں جب کھول کے بیٹھو تو نہ آگے سے نہ پیچھے سے کوئی بھی گزر نہیں سکتا تھا۔ اللہ کا شکر ادا کر کے وقت گزارنے لگی۔

قسمت نے ساتھ دیا میرے بہنوئی فائنانس سیکرٹری لگ گئے، میں نے فوراً ایک بلڈنگ کا نقشہ بنایا جس میں لیکچر ہال، لیبارٹری، آفیسز، باتھ روم، پیرامیڈیکل سٹاف کے کمرے غرض کہ تین منزلہ بلڈنگ کا نقشہ، ساتھ لیٹر لکھا ایک کاپی پرنسپل کو ''تھرو پروپر چینل'' دوسری ایڈوانس کاپی فائنانس سیکرٹری کو بھیج دی۔ کچھ ہفتوں کے بعد ہی لیٹر آ گیا کہ بجٹ منظور ہو گیا ہے اور جگہ بتا دی جائے جہاں یہ بلڈنگ بننی ہے۔

ماہ لقا کے ڈیپارٹمنٹ کے پیچھے ایک ویران پلاٹ تھا جو گھاس اور جنگلی پودوں سے بھرا پڑا تھا وہی جگہ بتا دی۔ جلدی ہی عمارت بننی شروع ہو گئی۔ اس دوران ڈاکٹر بلقیس فاطمہ ریٹائر ہو گئیں پھر ڈاکٹر بشارت یوسف آئیں۔ ایک سال کے بعد وہ بھی ریٹائر ہو گئیں تو ڈاکٹر نسیمہ نثار آ گئیں۔ وہ ساڑھے تین سال کے بعد ریٹائر ہو گئیں تو پھر ڈاکٹر نبیہہ حسن پرنسپل بنیں۔ اس دوران میں ہماری فورنزک میڈیسن کی بلڈنگ تیار ہو گئی۔ تین منزلہ بلڈنگ تو مل گئی مگر اُس میں تھا کچھ نہیں، بھاں بھاں کرتی بلڈنگ جس میں ماہ لقا سے لیا ہوا اُدھار میز اور دو عدد کرسیاں تھیں۔ جب کوئی ملنے آتا تو میری ڈیمنسٹریٹر اُٹھ کر باہر چلی جاتی اور آنے والا اُس کرسی پر بیٹھ جاتا۔

میرے ابا جی نے کالج جوائن کرتے وقت نصیحت کی تھی کہ ہر بات اور ہر کام لکھ کر کرنا اور اس کی ایک فوٹو کاپی اپنی فائل میں لگا کر رکھنا۔ چنانچہ بسم اللہ پڑھ کر اس پر عمل کیا اور تفصیل کے ساتھ مختلف لیٹر تیار کئے۔ ایک سٹاف کیلئے، ایک فرنیچر کیلئے، ایک اپریٹس (Appratus) کیلئے۔ فرنیچر کے لیٹر کو (Top priority) دی اور لیٹر لے کر پرنسپل صاحبہ ڈاکٹر نبیہہ حسن کے آفس تک گئی دروازے پر باہر ہی کھڑے ہو کر تین مرتبہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ پڑھا۔ اس آیت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اگر ظالم حاکم سے بات کرنے سے پہلے یہ پڑھ لی جائے تو وہ بھی موم

ہو جاتا ہے۔اس کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

ڈاکٹر صاحبہ اکیلی بیٹھی تھیں، بسم اللہ پڑھ کر خط پیش کیا۔انہوں نے خط پڑھا پھر واپس کر کے کہا ''ہمارے پاس بجٹ نہیں'' اور خود ٹیلی فون کا ریسیور پکڑ کر کسی سے باتیں کرنے لگیں مطلب یہ تھا کہ اب تم جاؤ۔دل برداشتہ ہو کر واپس آ گئی۔کچھ ہفتوں کے بعد پھر لیٹر لکھا اس کے اوپر فرسٹ ریمائنڈر (First Reminder) لال بال پوائنٹ سے لکھا نیچے موٹی سی لال لائن کھینچی اور پھر لے کر چل پڑی دروازے کے باہر پھر تین مرتبہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ ..... پڑھا اور دروازہ کھول کر اندر گئی۔وہ کسی سے فون پر باتیں کر رہی تھیں میں چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گئی بات ختم کر کے میری طرف متوجہ ہوئیں۔میں نے لیٹر آگے کر دیا، پڑھ کر بولیں ''یہ تو وہی لیٹر ہے میں نے تمہیں بتایا تھا کہ بجٹ نہیں'' اور مجھے واپس کر دیا میں رونے والی ہوگئی انہوں نے فون کا ریسیور پکڑ لیا۔مطلب یہ کہ تم جاؤ۔میں اپنے آفس میں آ گئی۔آفس میں بیٹھ کر دل میں بہت پچھتائی کہ کاہے کو یہاں آ گئی اچھی بھلی وہاں کام کر رہی تھی جو چیز چاہتی فوراً مہیا ہو جاتی تھی۔

ایک مہینہ اوکھا سوکھا گزارا۔پھر دل میں ہوک اُٹھی پھر لیٹر لکھا اب اوپر دوسرا ریمائنڈر لال بال پوائنٹ سے لکھا نیچے لال موٹی سی لائن کھینچی اور پھر ڈرتے ڈرتے گئی دروازے پر پھر فَبِاَیِّ اٰلَآءِ ..... پڑھا اندر گئی۔ڈاکٹر صاحبہ کوئی فائل دیکھ رہی تھیں۔بند کر کے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔میں نے لیٹر آگے کیا بہت دھیان سے پڑھا کچھ چیزوں پر ٹک مارک کیا، گھنٹی بجائی کلرک آیا اُسے میرا لیٹر دیا۔

''جس پر میں نے ٹک مارک کیا ہے وہ چیزیں سعدیٰ کو لے دو۔'' میں نے غنیمت سمجھا اور اپنے آفس میں آ گئی۔ڈیڑھ دو ہفتوں کے بعد وہ چیزیں مل گئیں تقریباً مہینے کے بعد میں نے پھر لیٹر لکھا جس میں باقی جو چیزیں رہ گئی تھیں لکھیں اوپر تھرڈ ریمائنڈر (Third Reminder) لال بال پوائنٹ سے لکھا نیچے لال لائن کھینچی اور پھر ڈاکٹر صاحبہ کے پاس پہنچ گئی اب کی بار وہ ہنس پڑیں اور میری ساری چیزوں پر ٹک مارک کیا اور کلرک کو بلا کر لیٹر دیا ''یہ ساری چیزیں منگوا دو۔'' انہوں نے میری طرف دیکھا ''اب خوش ہو؟''

''جی جزاک اللہ'' میں نے خوشی سے کہا اور اپنے آفس آ گئی مجھے لگتا تھا دن زیادہ ہی روشن ہے اور میرا وزن خوشی سے بہت ہی کم ہو گیا ہے۔

کچھ ہفتوں کے بعد کمروں اور باقی جگہوں پر بھی فرنیچر آنا شروع ہو گیا اور ڈیڑھ دو مہینوں میں ہماری بلڈنگ میں رونق ہوگئی۔اس کے بعد پھر میری آنیاں جانیاں شروع ہوگئیں۔کبھی لیٹر لے کر جاتی تو دکھی واپس آتی اور کمرہ میں آ کر رو لیتی۔کبھی لیٹر لے کر جاتی تو خوش خوش واپس آتی۔یہاں تک کہ ایک سال بیت گیا۔

ایک دن صبح میں کالج پہنچی، ابھی کرسی پر بیٹھی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔فوراً اٹھایا، دوسری طرف پرنسپل صاحبہ تھیں۔اس سے پہلے انہوں نے کبھی مجھے ڈائریکٹ فون نہیں کیا تھا، ہمیشہ کلرک ہی کرتا تھا اور پیغام دیتا تھا کہ پرنسپل صاحبہ یاد فرما رہی ہیں۔میں جاتی تو وہ کالج کا کوئی کام بتاتیں اور میں وہ کام کر دیتی۔

''سعدیٰ میں نے جمعہ کو ہیلتھ سیکرٹری کو خاص تمہارے لئے بلایا ہے، ٹھیک ساڑھے نو بجے تم آفس میں آ جانا۔جس جس چیز کی تمہیں ضرورت ہے لکھ لانا۔دیکھو لیٹر بہت امپریسو (Impressive) ہونا چاہئے'' اور ٹھک سے فون بند ہو گیا۔خوشی کے مارے میرا تو کوئی حال ہی نہ تھا۔سب سے پہلے PMDC (Pakistan Medical Dental Council) کے رولز نکالے پھر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج گئی۔فورنزک میڈیسن ڈیپارٹمنٹ کی اچھی طرح چھان پھٹک کی، کتنا ٹیچنگ سٹاف، کتنا فرنیچر، کتنے ماڈلز کتنا اپریٹس کتنے سٹوڈنٹ سب اچھی طرح دیکھا اور لکھا پھر علامہ اقبال میڈیکل کالج گئی وہاں کا فورنزک میڈیسن ڈیپارٹمنٹ اچھی طرح سے کھنگالا اور لکھا پھر واپس کالج آ گئی۔

اب تسلی سے بیٹھ کر پہلے PMDC کے رولز پڑھے اور اچھی طرح یاد کئے پھر کاغذ لیا اور اس پر چار کالم بنائے ایک PMDC دوسرا کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، تیسرا علامہ اقبال میڈیکل کالج اور چوتھا فاطمہ جناح میڈیکل کالج پھر ایک زبردست کمپیریٹو (Comparative) لسٹ تیار کی کہ کیا کیا کنگ ایڈورڈ اور علامہ اقبال میں تو ہے مگر فاطمہ جناح میں نہیں

ہے۔ جمعہ کا دن آیا گھر سے نماز حاجت پڑھ کر آئی ٹھیک ساڑھے نو بجے فون کی گھنٹی بجی ڈاکٹر نبیہہ حسن صاحبہ کا فون تھا ''سعدیٰ سیکرٹری صاحب آ گئے ہیں تم آ جاؤ'' دھڑکتے دل کے ساتھ فائل لے کر پرنسپل آفس تک گئی دروازے پر کھڑے ہو کر پانچ مرتبہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ پڑھا پانچ مرتبہ اس لئے کہ اب زیادہ بڑا ظالم آفیسر تھا جس کے سامنے جانا تھا۔ دروازہ کھولا، ڈاکٹر صاحبہ کے سامنے چار مرد حضرات بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحبہ کے پاس والی کرسی پر ابھی بمشکل بیٹھی ہی تھی کہ ڈاکٹر صاحبہ نے کہا ''سعدیٰ یہ فائل سیکرٹری صاحب کو دو۔'' میں نے فائل آگے کی ایک ڈیسنٹ سے مرد نے جس نے عینک لگائی ہوئی تھی اور ہلکا آف وائٹ کوٹ پتلون پہنا ہوا تھا میرے ہاتھ سے فائل لے لی اور کھول کر دیکھنے لگا اب میرا پورا دھیان فائل کی طرف تھا کہ کس صفحے کو زیادہ غور سے پڑھا جا رہا ہے آخری صفحے کو ختم کر کے فائل ساتھ والے صاحب کو پکڑا دی۔ اب میں نے دوسرے بندے کی طرف دیکھا گہرا سانولا رنگ سادی سی شکل بسکٹی رنگ کی شلوار قمیض پہنی ہوئی تھی میرے دل میں خیال آیا کہ یہ کوئی سیکشن آفیسر ہوگا اس نے جلدی جلدی صفحے پلٹے۔

''ڈاکٹر صاحبہ آپ نے تو سارے جہاں کا سٹاف لکھ دیا ہے، ہمارے پاس اتنا بجٹ نہیں۔''

میں نے سوچا یہ سیکشن آفیسر اب اس طرح کی باتیں کر کے سیکرٹری ہیلتھ کو تھپڑ کا دے گا۔'' آپ نے P,M,D, کے رولز پڑھ لئے ہیں؟'' میں نے ذرا تیز آواز میں کہا ''سٹاف کے لئے دو چیزیں ضروری ہوتی ہیں نمبر ایک سٹوڈنٹ اور دوسرا ورک لوڈ، جتنے ہمارے سٹوڈنٹ ہیں اتنے ہی کنگ ایڈورڈ میں ہیں اتنے ہی علامہ اقبال میں ہیں۔ جتنے لیکچرز اور پریکٹیکل کنگ ایڈورڈ اور علامہ اقبال میں ہوتے ہیں اتنے ہی ہمارے فاطمہ جناح میں بھی ہوتے ہیں۔ پھر انہوں نے کیا ثواب کا کام کیا ہے کہ انہیں تو پورا سٹاف مل گیا ہے اور ہم نے کیا گناہ کیا ہے کہ ہمارے پاس ایک اسسٹنٹ پروفیسر اور ایک ڈیمنسٹریٹر ہے۔''

اب میں نے پرنسپل صاحبہ کی طرف دیکھا کہ وہ بھی میرا ساتھ دیں میں گھبرائی اس لئے تھی کہ اگر یہ موقع نکل گیا تو پھر مدتوں سٹاف نہیں مل سکے گا مگر میں نے دیکھا کہ پرنسپل صاحبہ کی آنکھیں عینک کے پیچھے بھی مسکرا رہی تھیں اور چہرہ بھی۔

''ہمارے پاس بجٹ نہیں'' اُس نے پھر کہا اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''تو پھر آپ ہمارے لیکچرز اور پریکٹیکل بھی آدھے کر دیں۔'' میں نے جواب دیا۔

اس شلوار قمیض والے نے فائل پہلے والے آدمی کی طرف کر دی ''دیکھ لیں کیا کیا ہو سکتا ہے۔''

''سعدیٰ تم جاؤ'' ڈاکٹر صاحبہ نے فوراً مجھے کہا، میں عجیب کنفیوزڈ حالت میں اٹھ کر اپنے آفس آ گئی۔ طبیعت اتنی پریشان تھی کہ کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد فون کی گھنٹی بجی میں نے اٹھا کر سلام کیا دوسری طرف پرنسپل صاحبہ تھیں چہچہاتی آواز۔

''سعدیٰ تمہیں مبارک ہو تمہارا پورا سٹاف Sanction ہو گیا ہے'' پھر ہنس کر بولیں ''تم نے آج سیکرٹری صاحب سے خوب جھگڑا کیا۔''

''نہیں ڈاکٹر صاحبہ سیکرٹری صاحب تو بہت اچھے تھے بالکل خاموش رہے وہ سیکشن آفیسر زیادہ بول رہا تھا۔''

''تم جس کے ساتھ جھگڑ رہی تھی وہ ہیلتھ سیکرٹری تھے اور عینک والے ڈپٹی سیکرٹری تھے۔ بہر حال ٹیچنگ سٹاف اور پیرا میڈیکل سٹاف جو جو بھی تم نے لکھا تھا سب تمہیں مل رہا ہے'' اور ٹھک سے فون بند ہو گیا۔

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ہمیشہ تو نہیں مگر اکثر پہلے لیٹر پر ہی میری چیزیں سینکشن ہو جاتی تھیں۔ ایک سال اور گزر گیا میں نے ایسوسی ایٹ پروفیسر کیلئے اپلائی کر دیا۔ ایک لیٹر پرنسپل کو دوسری Advanced copy سیکرٹریٹ بھجوا دی اور پھر خود بھول بھال گئی۔ ڈیڑھ دو ماہ کے بعد ایک دن ڈاکٹر صاحبہ نے فون کیا اور مجھے آفس بلایا۔ میں گئی میز پر ایک خوبصورت عطر اور ساتھ اس کے ایک Thanks کا کارڈ۔ ''سعدیٰ یہ سینٹ اور کارڈ ایڈیشنل ہیلتھ سیکرٹری فرخندہ وسیم کو دے آؤ اور اپنے ایسوسی ایٹ پروفیسر کے آرڈر لے آؤ۔''

میں ہکا بکا انہیں دیکھ رہی تھی ''جزاک اللہ'' بمشکل میرے منہ سے نکلا وہ مسکرائیں اور میں سیکرٹریٹ روانہ ہوگئی۔اس کے بعد میں نے اکثر محسوس کیا کہ صبح جب میں کالج جاتی تو ڈاکٹر نبیہہ حسن کا فون آتا میں سلام کرتی وہ وعلیکم کہہ کر کوئی چھوٹا سا کام بتا دیتیں جو میں کر دیتی۔ایک دن فون آیا ''سعدیٰ تمہیں پتا ہے میں صبح تمہیں کیوں فون کرتی ہوں؟'' میں نے جواب دیا ''جی کوئی کام ہی ہوتا ہے'' ''نہیں تم واحد ہو جو فون اٹھا کر سلام کرتی ہو''ہیلو'' نہیں کہتی اور میں صبح صبح سلامتی لینے کیلئے تمہیں فون کرتی ہوں پھر دن بہت اچھا گزرتا ہے۔''

دن بھاگے جا رہے تھے پھر وہ دن آ گیا جس دن ڈاکٹر صاحبہ نے ریٹائر ہو کر جانا تھا وہ چارج ہینڈ اوور کرنے کیلئے پروفیسر فخر النساء کا انتظار کر رہی تھیں ہم سب اُداس سامنے بیٹھے تھے اُس دن ہم سب خاموش تھے مگر ڈاکٹر صاحبہ مسکرا مسکرا کر ہم سے باتیں کر رہی تھیں۔

'' آج میں نے چلے جانا ہے تو ایک بات تم لوگوں کو بتاؤں گی جس کا تم لوگوں کو پتا نہیں تھا۔جس دن میں نے پرنسپل بن کر آنا تھا تو میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب سب ڈیپارٹمنٹ والے لمبے لمبے لیٹر لکھیں گے اور چیزیں مانگیں گے۔ پہلے دو دفعہ تو میں ریجیکٹ (Reject) کر دونگی جو واقعی ضرورت مند ہوگا وہ پھر بھی آئے گا۔'' پھر میری طرف چہرہ کیا ''سوائے سعدیٰ کے..... یہ جب تک لسٹ پوری نہیں ہو جاتی تھی یہ پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔'' سب حیرانی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

''ڈاکٹر صاحبہ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے اس فیصلے نے مجھے کتنا رلایا تھا۔'' پھر ہم لوگ پھولوں سے بھری گاڑی میں انہیں اُن کے گھر چھوڑ کر آئے۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک دن ماہ لقا نے بتایا کہ ڈاکٹر نبیہہ حسن کو جگر کا کینسر ہو گیا ہے۔میں غم سے چور اُن کے گھر گئی وہ سوئی ہوئی تھیں میں بغیر ملے گھر آ گئی پھر پتا چلا کہ اُن کی بہن اُنہیں پنڈی لے گئی ہیں۔تھوڑی دیر بعد ہی یہ خبر آئی کہ وہ فوت بھی ہو گئی ہیں۔اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ:

اکثر سوچتی ہوں کہ ڈاکٹر صاحبہ تو ہر سٹیج ہی افراتفری میں گزار کر اپنی منزل پر بھی پہنچ گئیں۔

M.R.C.P کرنے کے بعد آتے ہی اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئیں جلد ہی ایسوسی ایٹ پروفیسر بن گئیں تھوڑی مدت بعد ہی فل پروفیسر پھر پرنسپل اور فٹافٹ اللہ تعالیٰ کے پاس بھی پہنچ گئیں۔

ہر ہر سٹیج ہی فٹافٹ نبھائی۔

اب تو یہ دل چاہتا ہے کہ جنت میں پھر اکٹھے ہو جائیں اللہ میاں سے کہیں کہ یہاں بھی ایک میڈیکل کالج بنا دے ڈاکٹر نبیہہ حسن اس کی پرنسپل ہوں اور ہم سب اُسی طرح ان کے اردگرد ہوں، جیسے اس دنیا میں تھے۔

☆.....☆.....☆

نصرت یوسف

سفیرِ سخن

وہاں کی سیر، جہاں ہر قدم پر ماضی دامن تھام لیتا ہے، ہر سانس وطن سے محبت کے قرض میں بندھ جاتا ہے اور ہر پل ایک نیا عزم دل میں جگا دیتا ہے

''اگر آتماؤں سے ملاقات کا وقت پورا ہو گیا ہے تو آپ واپس آجایئے۔''

میرے کندھے پر عقب سے کسی نے ہاتھ رکھا تو سر دلہر سی دوڑ گئی۔طہورہ میری کزن یہاں آ گئی تھی۔''کب سے سیل فون پر کال کر رہے تھے تمہیں، اٹھا کیوں نہیں رہی ہو؟۔''

اس نے ہاتھ میں پکڑا فون لہرایا تو میں نے شرمندگی سے کندھے پر ڈالے بیگ کو دیکھا جس کی جیب میں میرا فون سکون سے موجود..... اگر چیخا بھی تو مجھے لودھی اور 2015ء کے زمانے میں سفر کرتے آواز نہ آئی۔

''مغرب بالکل قریب ہے، چلو یہاں سے'' اسکے یہ کہتے ہی اسکے سیل فون سے اذان کی آواز بلند ہوئی چھوٹے دن تھے سوا چھ بجے مغرب ہوگئی تھی۔تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے طہورہ نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور دوبارہ اشارہ کیا نیچے آنے کا۔میں نے الوادعی نظریں بلند گنبد پر ڈالیں۔ہتھیلی مقبرے کی عمارت کی دیوار پر رکھ کر اسکے حسن، غرور، وقار اور شجاعت سے بنی دکھ کی خاموش زبان کو تھپکی دی اور قدم سرعت سے بڑھا دیئے۔

''اس وقت مقبروں میں رہنا مناسب نہیں ہوتا، ان روحوں سے چٹ چیٹ دن کی روشنی میں کی جاتی ہے!''

مجھے اسکے جملے پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔اذان نئی دہلی کی فضاؤں میں کہیں نہیں بلند ہوتی۔سرکاری طور پر اجازت نہیں ہے ماسوائے اکا دکا علاقوں کے۔سودن ختم ہو رہا تھا، مگر کوئی کائناتی پکار نہ تھی جو انسانوں کو یاد دلاتی کہ'' آؤ فلاح کی طرف'' جو جہاں مصروف تھا وہ وہاں مصروف رہا اور ہمارے مغرب کے تین فرض باغ میں ادا کرنے تک اندھیرا چھانا شروع ہو چکا تھا۔چھوٹے بچوں کی ماؤں کو درخت، مقبرے اور اندھیرے سے خاصے خدشات تھے، لہٰذا ہم نے تیزی سے باغ کے خارجی راستے کا رخ کر لیا۔انہی ننھے منے بچوں نے ہمارے پکنک کے وقت کو بھی خاصا لیٹ کر دیا تھا، محض ڈیڑھ گھنٹہ ہی ملا مغرب سے قبل، جبکہ پروگرام باغ سے کچھ ہی فاصلہ پر واقع ''انڈین اسلامک کلچرل سنٹر'' گھومنے کا بھی تھا جو بظاہر کھٹائی میں پڑتا نظر آیا، لیکن بھلا ہو خالہ جانی کا کہ ہم کچھ منٹ بعد اس دلکش عمارت میں داخل ہو رہے تھے جس کے ساتھ لفظ ''اسلام'' جڑا تھا، اور اس جوڑ نے اجنبیت جیسے سرے سے ختم کر دی تھی۔سب ہی کچھ اپنا اپنا لگ رہا تھا لیکن انتظامیہ کے چہرے ایکدم شناسائی کو دھندلانے لگے، مانوسیت کی لہریں ناہموار ہونے لگیں، میری کیفیت سن کر میری بہن رعنا نے بھی تائید کی کہ اسے بھی الارم سے بج رہے ہیں۔

''ہاں تو یہاں سب اختیار مسلمانوں کا نہیں ہے، بہت عملہ غیر مسلم ہے۔'' ہمارے میزبان ہماری الجھن کو سلجھا چکے تھے۔

طاقت اور اختیار کی یہاں بھی وہ نمائشی حیثیت تھی جو ہندوؤں کی تنگ نظر فکر کا بنیادی حصہ ہے۔حالانکہ دلی کو جب بھی حسن ملا اس میں مسلمان حکمرانوں کا اس شہر سے خصوصی تعلق تھا۔پورے ہندوستان کی سرزمین مسلمانوں کے اس التفات پر گواہ ہے۔ہر جگہ عمارتیں موجود ہیں، جن کا طرز تعمیر لاکھ کوششوں کے باوجود ہندوانہ نہیں لگتا ورنہ سب سے پہلے تاج محل ہی مندر قرار پا چکا ہوتا۔گو دعوے بے شمار تاج محل کے بارے میں بھی کئے جاتے ہیں، جس کا ہدف اس کو ہندو مقام ثابت کرنا ہے، لیکن شکر ہے اب تک بابری مسجد کی طرح تاج پر ترشول کا قبضہ نہیں ہو سکا۔

کلچرل سنٹر کی عمارت دیدہ زیب تعمیر ہوئی ہے۔نماز روم ہم نے

خاص طور پر جا کر دیکھا، خالی تھا لیکن کچھ منٹ خدا کی یاد میں وہاں گزار کر دل نے دعا کی ''یارب ان لمحات کو ہمارے حق میں قبول فرما'' ذائقہ دار حلال گوشت سے بنے کھانوں کے لئے مشہور مسلم ریسٹورنٹ ''کریم'' بھی اسکے احاطے میں ہے۔ کریم کا کھانا کتنے بھی مزے کا تھا لیکن پھر بھی کراچی کے کھانوں کے آگے اسکی تعریف نہیں کی جا سکتی ۔ یہ بات گوشت سے بنے کھانوں کے لئے ہے ورنہ سبزی بھاجی والے کھانے بلا شبہ دہلی میں زیادہ ذائقہ دار ہوتے ہیں، نہ صرف مزے دار بلکہ تنوع بھی مہیا ہے ۔ ہر کچھ عرصے بعد ایک نئ چٹ پٹی سی ڈش عوام کے لئے مارکیٹ میں آ جاتی ہے اور لوگ گوشت کا ذائقہ فطری طور پر پسند کرنے کے باوجود اس کی جانب ڈھیر نہیں ہوتے ۔صحت بھی اچھی رہتی ہے اور کھال بھی۔ میں نے ہندوستانیوں کو اس بار صحت اور حسن کے اعتبار سے بہت عمدہ حالت پر پایا دہلی میں نہ اب کالے رنگ کی کثرت تھی اور نہ فربہ جسم کی متناسب جسم اور صحتمند گندمی رنگت عمومی نظارہ تھی ۔ دہلی شہر میں تقریباً چودہ پندرہ برس قبل میٹرو ٹرین کا آغاز ہوا تھا، جس نے فاصلہ اور سفر کی پریشانیوں کو اس قدر کم کر دیا کہ ہندوستان بھر سے لوگ کھچ کر دہلی شہر میں آنے لگے ۔نت نئے مواقع روزگار، تعلیم اور صحت کے میٹرو کی بہترین اور سستی مگر عمدہ ترین ٹرین سروس نے مہیا کر دیئے ان پندرہ سالوں میں ٹرین نیٹ ورک میں تیزی سے اضافہ ہوا اور اب زیر زمین نظام اس قدر فعال ہو چکا ہے کہ دہلی بنا میٹرو ٹرین ادھورا ہے۔ انڈین کرنسی کے محض دس روپے (ہمارے تقریباً سترہ روپے) میں شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک میٹرو کے بہترین اور صاف ستھرے چمکتے دمکتے اسٹیشن پر رکتی، اے سی والی، بہترین حالت کی ٹرین میں سفر کر کے جایا جا سکتا ہے ۔ وہاں بس دہلی کے باسیوں کو اسٹیشن کی ڈھیروں سیڑھیوں کو کثرت سے استعمال کرنا پڑتا ہے، برقی بھی ساتھ ساتھ مہیا عموماً ہوتی ہیں اور کہیں کہیں لفٹ بھی مریضوں کے لئے لیکن عمومی طور پر میٹرو ٹرین کا سفر صحتمند لوگوں کا کام ہے ۔ وسیع و عریض اسٹیشن پر خاصا چلنا پڑتا ہے مگر چونکہ دہلی کے باسیوں کی صحت کا معیار بہت بہتر ہے لہٰذا یہ مشقت سب لوگ برداشت کرتے ہیں۔صورتحال کی بہتری میں بنیادی کردار مستحکم سیاسی حکومت اور فعال سرکاری اداروں کا ہے ۔ ان اداروں کا مقابلہ اپنے ہاں کے نظام سے کرو تو دل اور روح دونوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ مستحکم نظام تعلیم جو پاکستان اور مسلم مخالف کتنا بھی ہو لیکن اپنی قوم کے لئے واضح سوچ اور نظریہ رکھتے ہوئے مرتب کیا گیا ہے ۔ ان کی قوم کے لئے پاکستان قابل تقلید نہیں ، جوانوں کو اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر ہے ۔اس میں ان کے تعصب کو بھی دخل ہے کہ پاکستان کو پس ماندہ سمجھا جاتا ہے جس کی کوئی بھی خوبی انکو خوبی نہیں لگتی سوائے شوبز کے سطحی انسانوں اور کرداروں کے ۔ یہ قوم پاکستان اور مسلمانوں کے لئے انتہائی متعصب اور تنگ ذہن ہے ان کی تنگ ذہنی میں قصور انکا خدا کے بارے میں عقیدے کا بھی ہے ۔ انسانوں کے اعمال و افعال میں کلیدی کردار انکا خدا کے بارے میں تصورات کا ہوتا ہے وہ پتھر کے خداؤں کو پوجتے ہیں ، جنکی ظاہری حیثیت تک اس قدر غیر فطری اور لطافت سے بعید ہے کہ کسی بھی اعلیٰ اور فراخ سوچ کا اثر اس کے پجاریوں پر ہونا ناممکن ہے ۔ جیسے وہ بے جان موریتوں کے آگے ماتھا ٹیکتے ہیں ، ویسے ہی بے جان انکے تصورات زندگی ہیں ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارے روح سے خالی سجدے، جنکے کوئی اثرات ہماری زندگیوں پر نظر نہ آئیں۔

میٹرو اسٹیشن کی برقی سیڑھیاں متحرک تھیں ، میں اس پر کھڑی اس معصوم سے پھول چہرے کو تک رہی تھی جس کے اجلے ماتھے پر ماں نے لہو رنگ کی بندیا لگا کر اس کی فطرت کو مسخ کرنے کی کوشش کی تھی ۔ رحمٰن نے اسے اپنا بندہ بنایا تھا، وہ اسے شیطان کے ٹولے میں شامل کر رہی تھی ۔ بچی مستقل بے آرام تھی، نہ جانے کیا مسئلہ تھا میں نے بیگ سے چاکلیٹ نکال کر اسے دینا چاہی تو اس نے نفی میں گردن ہلا دی اور اسی لمحہ ہم سیڑھیوں کا سفر طے کر چکے تھے ۔ ماں نے نہایت خوبصورت مسکراہٹ سے مجھے دیکھا اور آگے بڑھ گئی ۔ بلیو جینز پر دھاری والی ٹی شرٹ پہنے تھی لیکن اپنا مذہبی تشخص اس کے ماتھے پر بھی چسپاں تھا۔ اسٹپس میں بالوں کی کٹنگ تھی جس پر اس نے اپنے دھوپ کا برانڈڈ چشمہ لگا رکھا تھا۔

اس اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی پرانی دہلی کا علاقہ تھا، اذان کی آواز دنوں بعد سنی تو جیسے جسم و روح کے ہر جوڑ و بند میں تازگی سی دوڑ گئی.....لات

اورعزیٰ کی نسل کے تمام سنگی وجود مجھے چٹختے سے محسوس ہونے لگے۔قریب ہی مندر تھا، اذان کی پھیلتی گونج نے اس طرف اٹھتے قدموں کو کچھ تو ٹھٹکایا ہوگا، میں جانتی نہیں لیکن سوچ ضرور آئی۔

نئی دہلی سے پرانی دہلی تک میٹرو بس میں سفر اس لیے کیا تھا تا کہ اپنی ایک پرانی دوست سے ملاقات کی جائے جو شادی ہو کر پندرہ برس قبل کراچی سے دہلی آ گئی تھی۔گو یہاں قریبی عزیز اب بھی قیام پذیر ہیں لیکن اس جگہ کے رش اور تنگ راستوں سے ویسی ہی گھبراہٹ ہوتی تھی جیسے کراچی شہر کے قدیم علاقوں میں جا کر دل گھبراتا ہے بے ہنگم ٹریفک، رش اور تنگ راستے یہ سب دہلی کے پرانے علاقوں میں تھا مگر ایک نمایاں فرق گالم گلوچ کی مقدار میں کراچی کی نسبت خاصی کمی تھی۔برداشت اور انتظار کا عنصر خاصا بہتر حالت میں نظر آیا۔سوکھے سوکھے جسم سائیکل رکشہ کھینچ رہے تھے، مسلمانوں کی کثیر تعداد اس سے روزی روٹی کا بندوبست کرتی ہے۔مجال ہے کوئی سردار اس پیشہ سے وابستہ ہو۔سکھوں کی معاشی حالت دہلی شہر میں خاصی اچھی ہے بھارتی سرکار مسلمانوں کو کچل کر دوسری اقوام کو آگے بڑھاتی ہے، خواہ وہ تعلیم کا میدان ہو یا کھیل کا، جہاں کوئی مسلمان اپنی واضح شناخت کے ساتھ ابھرتا نظر آیا وہیں اس کو کچل دیا جاتا ہے، ابھارا جاتا ہے تو ثانیہ مرزا جیسی عورت کو جس کی عادات، حرکات وسکنات اور پہناوے سے اس کا تشخص رتی برابر ظاہر نہیں ہوتا اور وہ بقیہ مسلمان نوجوان لڑکیوں کے لئے ایک رول ماڈل کی طرح رکھی گئی ہے اور عرفان پٹھان کو اس کی صلاحیتوں کے باوجود دبا دیا گیا کیونکہ اس کے اور اس کے خاندان کے ظاہر سے اس کی دینی شناخت ابھرتی ہے۔

یہ معاملہ ہر سطح پر ہے اس کے باوجود بھارتی مسلمان پاکستان کو آئیڈیل نہیں بناتے، انہوں نے برسوں پہلے پاکستان سے لگاؤ ترک کر دیا ہے کیونکہ بظاہر ہمارا ملک ایک ایسے دور سے گزر رہا ہے جس میں آنکھیں جل رہی ہیں اور منافقت اور اختلافات نے 194 میں جنم لینے والی امیدوں اور تمناؤں کو رقصِ شرر میں تبدیل کر دیا ہے۔ہر معاملہ میں تپش ہے۔ابر کی صورت گری کرنے سے سرکار اور قوم دونوں ہی عاری ہو چکے ہیں۔انفرادی سطح پر بھی ہم وسیع القلبی اور وسیع النظری سے محروم جسم ہیں اور سرکار تو سب سے زیادہ گلا سڑا طبقہ ہے۔وطن کی محبت کے نام پر یہ اجسام تھرک تو سکتے نہیں، موسیقی کے سروں پر متحرک بھی ہو سکتے ہیں، چاند تارے جسم پر چسپاں بھی کر سکتے ہیں لیکن احساس ذمہ داری اور وفاداری جیسے بنیادی اوصاف کے لئے جن تقاضوں کا ہونا ضروری ہے جن سے قومیں عروج کی جانب سفر کرتی ہیں، امن اور خوشحالی سے بہرہ ور ہوتی ہیں وہ عناصر ہماری قوم میں ناپید ہیں۔

ہاں کچھ سر پھرے ہیں جو ان تند و تیز ہواؤں میں دیئے جلاتے رہتے ہیں، کٹتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں اپنے وطن اور دین کے لئے، وہ چاہے نامور ہوں یا گمنام، طوفانوں سے ٹکراتے ہی رہتے ہیں اور اصل میں یہ ہی قلیل ان کثیر شور شرابا کرنے والوں کی بھی حفاظت و آبرو کے محافظ ہوتے ہیں۔ان لفظوں کے ساحروں کی حرمت کی نگہبانی بھی وہ کر جاتے ہیں۔جن کو دنیا سودائی کہہ جاتی ہے لیکن یہ وطن کے رکھوالے، وطن کا جھومر ہیں، یہ استاد بھی ہیں، یہ لوہار بھی ہیں، یہ سپاہ بھی ہیں، یہ ریڑھی بان بھی، یہ لعل کسی بھی جگہ مل جاتے ہیں لیکن من حیث القوم یہ عنقا ہیں۔

ہندوستان کی سرکار ذات پات، اونچ نیچ میں مذہبی تفریق رکھنے کے باوجود انسانوں کے انبوہ کثیر کو قوم، ایسی قوم جو ہندوستان کے لئے عمدہ ہو مگر دوسری اقوام اور مذاہب کے لئے تنگ نظر ہو، تیار کر چکی ہے۔انکا نظام تعلیم اس ہی مقصد کے تحت تیار کیا گیا ہے، ان کی تمام سرگرمیاں اس نظریہ ''ہندتوا'' تلے گھومتی ہیں اور انکی زبانیں انگریزی بولنے کے باوجود سنسکرت کو اہم ترین مضمون مانتی ہیں جس میں انکا تمام مذہبی مواد ہے۔

یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارا نوے فیصد مذہبی نصاب اردو زبان میں ہے جس کو اہمیت دینا پاکستانیوں کو ترجیحات کی فہرست میں رکھنا مذاق لگتا ہے۔ ''اردو نہ بھی آئے تو فلاح ہے ہاں انگریزی نہیں آتی تو بندہ محض ملاح ہے۔'' سوچ کے یہ زاویے بنانے میں ان پالیسیوں کا بڑا دخل ہے جنہوں نے آزادی کے اڑسٹھ سال بعد بھی اردو کو غلاموں کی زبان کا درجہ دیا ہے۔پانچ سال کی عمر تک بچہ ''پودے کو ہوا، پانی اور روشنی کی ضرورت ہوتی ہے'' جیسا عام فہم اور روزمرہ کے مشاہدے سے بھرپور جملہ ''یاد'' کرنے کے لئے اپنی قیمتی ترین ذہنی استعداد اور وقت لگاتا ہے کیونکہ نام نہاد سائنس کا مضمون

انگریزی میں پڑھایا جاتا ہے جبکہ وہ خواب اردو میں دیکھتا ہے۔شعور اور لا شعور کا یہ ٹکراؤ قوم کو منجمد حالت سے حالت زوال کی جانب گامزن کر دیتا ہے، تحقیق کا سفر رک جاتا ہے، تخلیق خوابیدہ ہو جاتی ہے اور سطحی سوچ اور لا حاصل فلسفے خودرو نباتات کی طرح قوم میں پھیل جاتے ہیں۔

اردو زبان کسی بھی قوم کی ذاتی زبان نہیں، یہ ایسا گلدستہ ہے جو پاکستان کی تمام زبانوں کی خوشبو اپنے اندر سموئے ہے۔انگریزی سے بدرجہ آسان اور عام فہم پورے پاکستان کے لئے۔ ہندوستان بھر میں اس قدر مختلف اور اتنی کثرت سے بھاشائیں پائی جاتی ہیں کہ انکے پاس انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے سوائے کوئی سہل راستہ نہیں، یہ مسئلہ الحمدللہ پاکستان کو درپیش نہیں لیکن پھر بھی سرکار عہد غلامی کی زبان کو دل و جان سے لگائے بیٹھے اپنے قیمتی ترین دماغوں کو سوچ سے عاری قوم بنا چکی ہے۔ انگریزی کو ذریعہ تعلیم دیکھنا میرے لئے ہمیشہ ہی تکلیف دہ موضوع ہوتا ہے یہ محض ان لوگوں کی زبان ہے جو نوے فیصد پاکستان پر حکومت کرنے کے لئے تیار کئے جاتے ہیں وہ گوروں میں سے نہ سہی مگر گوروں کے وفاداروں میں سے ہوں انکو مخصوص ذہنی اور جسمانی طرز پر تیار کیا جاتا ہے جس سے یہ نوے فیصد پاکستان پر اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہیں۔

بات دہلی کے میٹرو اسٹیشن سے ہوتی شاہ اور شاہ کے وفاداروں تک پہنچ گئی کیونکہ دل ہر وقت اور آنکھ ہر لمحہ گزرتے منظر پر سود و زیاں کے حساب کتاب میں مصروف ہوگئی تھی، یہ وہ سرزمین تھی جہاں اقبال نے دل کی گہرائیوں سے نغمہ تخلیق کیا ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا ۔ ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا'' اقبال جیسے آفاقی شاعر کو ہندوستان کی سرزمین سے محبت تھی، اسی سرزمین کے بطن سے پاکستان نے جنم لیا اور جب دنیا کے نقشہ پر مشیتِ ایزدی کے تحت یہ معجزہ رونما کر دیا گیا تو ''کلیم عثمانی'' نے یہ لافانی نغمہ تخلیق کیا جسے مہدی حسن کی آواز نے امر کر دیا۔

یہ وطن تمہارا ہے .....تم ہو پاسباں اسکے
یہ چمن تمہارا ہے .....تم ہو نغمہ خواں اسکے
اس چمن کے پھولوں پر رنگ و آب تم سے ہے
اس زمین کا ہر ذرہ آفتاب تم سے ہے
یہ فضا تمہاری ہے ، بحر و بر تمہارے ہیں
کہکشاں کے یہ جادے رہگزر تمہارے ہیں
اس زمین کی مٹی میں خون ہے شہیدوں کا
ارض پاک مرکز ہے قوم کی امیدوں کا
نظم وضبط کو اپنا میر کارواں جانو
وقت کے اندھیروں میں اپنا آپ پہچانو
میر کاروں ہم تھے ، روح کارواں تم ہو
ہم تو صرف عنواں تھے ، اصل داستاں تم ہو
نفرتوں کے دروازے خود پہ بند ہی رکھنا
اس وطن کے پرچم کو سر بلند ہی رکھنا
یہ وطن تمہارا ہے تم ہو پاسباں اسکے

سائیکل رکشہ دہلی کے پرانے علاقے میں موجود رش میں پھنس چکا تھا۔ پسینے کی دھاریں تپتی دھوپ میں رکشہ والے کے جسم سے بہہ رہی تھیں ۔موسم براہ راست دھوپ میں ٹھنڈا نہ لگ رہا تھا۔ عجیب کیفیت میں میرا دل تھا، نغمے کے بولوں کی بازگشت اور سامنے دھوپ میں لاغر جسم، میلوں دور تک نظر آتا رش مجھے باور کرا رہا تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کے لیے بلاشبہ جنت ہوسکتا ہے لیکن کلمہ طیبہ قبول کرنے والوں کو یہاں سایہ عافیت ملنا محض دیوانے کا خواب ہے جسے قائداعظم اور انکے ہم خیال ساتھی جان چکے تھے۔ یہ رام کا نام لے کر بندہ مارتے ہیں۔ہم اللہ کا نام لے کر جانور قربان کرتے ہیں انکے ہاں انسانی خون کی بھینٹ ہے ہمارے ہاں جانور کو ذبح کیا جاتا ہے۔خون دونوں بہاتے ہیں لیکن توحید اور شرک کا کیا جوڑ، توحید قیصر و کسریٰ کے محلات زمین بوس کر کے انسان کو انسان کے برابر کھڑا کرتی ہے۔شرک قیصر و کسری کو جنم دیتا ہے۔

میں رکشہ کے اوپر تنی چھتری تلے بیٹھی تھی، اپنے آپ کو دھوپ میں پسینہ بہاتے رکشہ کھینچتے انسان کا مجرم محسوس کرنے لگی تو گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، ساتھ بیٹھی والدہ سے کہا ''ہم اتر کر پیدل چلتے ہیں۔ کچھ ہی

فاصلہ باقی ہے'' رکشہ والے نے پریشانی سے ہم کو دیکھا ''میڈم یہ ابھی چھٹ جائے گا، آپ لوگ بیٹھو'' وہ سمجھا ہم اتر گئے ہیں گویا اس کی آمدنی بھی رخصت ہو رہی ہے، امی نے طے شدہ رقم سے اوپر رقم اسکو تھماتے میرا ہاتھ تھامتے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں اس کے احساس شکر سے لبریز تاثرات سے اپنے نفوس کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں تیزی سے اس جگہ سے ہٹ گئے۔ انسانی نفس اللہ کی دی توفیق سے کسی کی مدد کرنے کے بعد جھکا سر اور جڑے ہاتھ دیکھنے میں لطف محسوس کرتا ہے۔ اللہ ہی کی رحمت ہوتی ہے کہ بندہ محفوظ رہے۔

رزق حلال کے لئے محنت کرنا پسینہ بہانا عبادت ہے لیکن انسان کا انسان کے لئے اپنی مرضی سے اوتار بن جانا اس کی تذلیل ہے میں نے قطار در قطار سائیکل رکشہ میں بیٹھے مسافروں پر نظر ڈالی، اکثریت خوشحال چہروں کی تھی، جبکہ کھینچنے والے سب ایک جیسے، سوکھے، جھلسے جسم، ناکافی لباس، کٹھن زندگی، جھکی جھونپڑی کے مکین، جن کی نسل نے صحت اور تعلیم سے محرومی آنکھ کھولتے ہی ورثہ میں پائی ہوگی۔ نہ ان میں کوئی برہمن ہوگا اور نہ کھتری نہ سکھ، نہ بدھ۔ اکثریت ان انسانوں کی ہے جن کے آباؤ اجداد نے ہندوستان پر بڑی شان سے حکومت کی اور اسے بڑی محبت سے سنوارا، اس کی فضاؤں میں خدا کی کبریائی کی اذانیں گونجیں، روحانی اور جسمانی آزادی کا مقصد دیا، ستی کے مقابلے میں عورت کے لئے محبت کا استعارہ تاج محل آگرہ کی سرزمین پر ابھرا۔ یہ سب ان نحیف وکمزور جسموں کے پُرکھوں کی برکات تھیں، اور ان ہی سے کفر کے پجاری خوفزدہ بھی ہیں اور نفرت زدہ بھی۔

یہ سب حقیقتیں اپنی جگہ جو تلخ بھی ہیں اور سفاک بھی لیکن ہندوستان کی مجموعی ترقی کی رفتار پاکستان سے کئی گنا تیز ہے اور میں تو اسکے دارالخلافہ میں موجود تھی جہاں کی شان ہی اور ہے۔ میری اس تعریف میں بہت ممکن ہے میرے جذباتی لگاؤ کا دخل بھی خاصہ ہو لیکن دنیا ہندوستان کو اس کی ترقی اور سیاسی استحکام کی بدولت بھی ہم سے زیادہ اہمیت دیتی ہے تنگ اور رش والے راستے پر کچھ منٹ چلنے کے بعد ایک پھاٹک نما گیٹ پر کھڑے کچھ لمحے توقف کیا، ماضی پھر قوت سے دامن کھینچنے لگا، یہ وہ گلی محلے تھے جن کا ذکر اپنی مرحومہ دادی سے سنا تھا، وہ وقت میرے جسم پر نہیں گزرا لیکن میری روح جیسے وہاں پہنچ گئی جو دادی مرحومہ کا زمانہ تھا بگھیاں اور پالکیاں کیا اور سقہ، کے قلعی سے چمکتے چاندی کے برتن، قلیل مقدار میں موٹر کاریں، زمین وآسمان کا عالم سکوت، ورق سے تسبیحی شیرنی کے تھال، حلال حرام کی واضح تفریق۔ میرے اٹھتے قدم تھمے، ماضی سے حال کا سفر آناً فاناً طے ہو گیا جیسے میں فلم (Back to the future) کا کردار تھی، سیل فون پر انیقہ کا لنک چمک رہا تھا۔ فون دوست کا تھا، پوچھ رہی تھی کیا مجھے گھر ڈھونڈنے میں کسی دشواری کا سامنا ہے میں نے اسے تسلی دی ایسا کچھ نہیں، بس زمانہ بدل گیا تھا اس لئے قدم بہت دھیمے ہو گئے تھے۔ امی بھی میرے ساتھ تھیں تو انکو بھی آسانی رہی۔

اگلے منٹ ہی ہم مطلوبہ گھر پہنچ چکے تھے۔ گلیاں کتنی بھی تنگ تھیں، بوسیدگی ماحول میں کتنی بھی ظاہر تھی لیکن گندگی کے ڈھیر اس مقدار میں نہ تھے کہ اسے مکھی، مچھر کا کروچ یا گٹر کا لونی کہا جاتا۔ ہلکا پھلکا کاغذ کا کوڑا بلاشبہ تھا، تعفن نہ تھا، مجھے کراچی کے وہ پوش علاقے یاد آ گئے جہاں کوڑے کے ڈھیر جگہ جگہ تعفن اور بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ کسی دن اس ڈھیر کو آگ بھی لگا دی جاتی ہے تاکہ میونسپل کمپنی کا کام وہیں ختم ہو جائے چھوٹے اور پس ماندہ علاقوں کا تو قصور بھی نہیں کہا جا سکتا وہ کس ناگفتہ بہ حالت میں ہیں۔ صفائی انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ انسان میں شر پنپنے کی قوت گندگی میں زور پکڑ جاتی ہے اس لئے جرائم غلیظ علاقوں سے بھی نمو پاتے ہیں۔

گھر کا دروازہ کھل چکا تھا۔ سامنے انیقہ کھڑی تھی۔ ہم دونوں اتنی گرمجوشی سے سلام کرتے ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے کہ لگتا تھا سالوں کا فاصلہ مٹا دینگے۔

انیقہ سے ملنا اور یادوں اور تاثرات کے ورق لکھنا اپنی جگہ ایک موضوع ہے۔ امی اور انیقہ کی ساس بھی ایک دوسرے کی واقف کار تھیں، سو اب انیقہ تھی اور میں، صحن میں بچھا تخت تھا اور طرح طرح کے پودوں سے سجا اسکا گوشہ۔ میں نے بے اختیار انیقہ کا ہاتھ تھاما۔

''تم گرین تھمب ہو نا نقی!'' تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''تم اب

بھی ایسے ہی ہنستی ہو نقی!'' میں نے مسرت سے اس کو دیکھا۔

''ہاں تو بچے نہ ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ بندہ ویران ہو جائے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے میرے منہ میں پانی پوری (گول گپہ) ٹھونس دیا۔آسمان پر خوبصورت دھاریاں بن رہی تھیں، زندگی کے خوبصورت لمحے منٹ بہ منٹ گزر رہے تھے۔میرے سفر کا ایک اہم ترین جز انیقہ سے ملاقات.....اورانیقہ پاکستان کی کہانیاں سننے کی متمنی تھی۔میں نے اچھی امیدوں اور آرزوؤں سے سجی جھلملاتی باتیں شروع کردی تھیں جو ہر باشعور پاکستانی کا خواب بھی ہیں اور ارمان بھی۔ یہاں پہ میں اپنا قلم روکتی ہوں اور مملکت خداداد پاکستان سے تجدید عہد وفا کرتی ہوں۔

☆.....☆.....☆

آسیہ راشد

بھوپال کی بیگمات

چار مسلم خواتین حکمرانوں کا تذکرہ جنہوں نے تقریباً سو سال
1819ء سے 1926ء تک بھوپال پر حکمرانی کی

بھوپال کی تاریخ پر نگاہ دوڑائی جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ بھوپال وسطی ہند کی دوسری بڑی اور خوشحال مسلم ریاست تھی۔ پہلی بڑی ریاست حیدر آباد دکن کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس ریاست کی بنیاد اورنگ زیب عالمگیر کے ایک سپہ سالار دوست محمد نے رکھی جو افغانستان سے آیا تھا۔ اس کی حکومت بننے کے بعد یہاں اسلامی اثر ورسوخ دکھائی دینے لگا اور بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد یہ ریاست انگریز کی عملداری میں آ گئی۔ تقسیم ہند کے بعد تمام ریاستوں کو صوبوں میں ضم کر دیا گیا، یوں یہ ریاست صوبہ مدھیہ پردیش میں ضم کر دی گئی۔ اس ریاست کا رقبہ 6871 مربع میل ہے اور آبادی تیس لاکھ ہے۔ اسے جھیلوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے دنیا بھر سے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں سیاح یہاں سیر و تفریح کیلئے آتے ہیں۔ مسحور کن نظارے، زمین کی تزئین و آرائش، جھیلیں، تاریخی عمارات یہاں کا دائمی حسن ہیں۔

اس شہر کو حسین اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنانے میں ان چار مسلمان خواتین فرمانرواؤں کی محنت و کوشش کا عمل دخل ہے جنہوں نے تقریباً سو سال سے زائد عرصے تک یکے بعد دیگرے یہاں پر حکومت کی۔ تاریخ میں انہیں ''بیگمات بھوپال'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ نواب قدسیہ بیگم، نواب سکندر بیگم، نواب شاہ جہاں بیگم اور نواب سلطان جہاں بیگم۔

نواب قدسیہ بیگم 1837ء-1819ء:

ان کا اصل نام گوہر تھا۔ یہ نواب غوث محمد خان صاحب کی صاحبزادی تھیں۔ ان کی شادی نواب نظیر الدولہ سے ہوئی۔ شادی کے تین سال بعد نواب نظیر الدولہ کا انتقال ہو گیا، انہوں نے اپنے پیچھے ایک بچی سکندر بیگم چھوڑی۔ ریاست کے تمام عمائدین کے مشترکہ فیصلے سے نواب قدسیہ بیگم کو والی بھوپال مقرر کر دیا گیا۔ اسی سال ان کے والد نواب غوث محمد خان کا بھی انتقال ہو گیا لیکن انہوں نے بڑے حوصلے سے کام لیا اور ریاست کا انتظام بہت خوش اسلوبی سے چلایا۔

آپ بڑی دانا، فیاض اور دلیر خاتون تھیں۔ انہوں نے بھوپال میں ایک شاندار جامع مسجد بنوائی اور ایک خوبصورت محل بھی بنوایا جسے گوہر محل یا نظیر محل بھی کہا جاتا ہے۔ بھوپال کے شہریوں کو صاف پانی مہیا کرنے کیلئے واٹر ورکس بھی بنوایا۔ صدقات و خیرات کرنے میں بھی بہت کشادہ تھیں۔ سینکڑوں غرباء و سائلین ان کے دستر خوان پر پرورش پاتے۔

وہ پڑھی لکھی نہیں تھیں مگر بہت دور اندیش معاملہ فہم اور بہادر خاتون تھیں۔ انہوں نے پردے کو خیر باد کہہ کر ریاستی معاملات انجام دیئے باقاعدہ اعلان کروایا کہ ان کے بعد ان کی بیٹی سکندر جہاں بھوپال کی حکمران ہوگی۔ ان کے خاندان کے کسی مرد کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ ان کے اس فیصلے کو چیلنج کر سکے۔ وہ ریاست کے تمام امور کو بخوبی نپٹانا جانتی تھیں۔ حالات حاضرہ سے پوری طرح باخبر رہتیں۔ ہر روز رات کو خبروں سے آگاہ ہو کر پھر رات کا کھانا کھاتیں۔ اپنی وفات سے پہلے اپنی بیٹی کو بھوپال کا حکمران بنا گئیں۔

نواب سکندر بیگم 1868ء-1860ء:

نواب سکندر بیگم کی شادی نواب محمد خان سے ہوئی۔ دو تین سال تک تو میاں بیوی کے تعلقات بہت خوشگوار رہے لیکن کچھ عرصہ بعد کشیدہ ہو گئے۔ نواب سکندر بیگم نے اگرچہ اپنی والدہ کی طرح پردے کو خیر باد نہیں کہا مگر ان کے شوہر اس معاملے میں خاصے متشدد تھے۔ ایک دن اسی معاملے میں دونوں میاں بیوی کا جھگڑا ہو گیا۔ نواب جہانگیر خان نے ان

پر تلوار اٹھالی جس پر ان کی ازدواجی زندگی میں شدید بگاڑ پیدا ہوگیا۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ جہانگیر خان نے یہ مطالبہ کیا کہ بحیثیت شوہر والیِ بھوپال بنا کر عنان حکومت ان کے ہاتھ میں دے دی جائے۔

جب یہ بات قدسیہ بیگم کے علم میں آئی تو انہوں نے ناراض ہوکر جہانگیر خان کو نظر بند کر دیا۔ لیکن وہ کسی طرح سے نظر بندی سے نکل کر سیہور پہنچ گئے اور کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ اب قدسیہ بیگم اور نواب جہانگیر میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ آخر اس معاملے میں انگریزوں نے مداخلت کی اور قانون کے مطابق ریاست نواب جہانگیر خان کے سپرد کر دی۔

نواب سکندر بیگم شوہر سے ناراض ہوکر اپنی والدہ کے پاس اسلام نگر چلی گئیں جو بھوپال کا دارالخلافہ تھا۔ وہیں ان کے بطن سے نواب شاہ جہاں بیگم پیدا ہوئیں اس کے تقریباً چھ سال بعد نواب جہانگیر خان وفات پا گئے۔

نواب جہانگیر خان کی وفات کے بعد سکندر بیگم نگران ریاست مقرر ہوئیں اور منشی جمال الدین ان کے وزیر اعظم بنے۔ نواب سکندر جہاں نے اسی سال اپنے وزیر اعظم منشی جمال الدین سے نکاح ثانی کرلیا۔

حکومت ہند کا یہ قانون تھا کہ اولاد نرینہ نہ ہونے کی صورت میں بیٹی کا شوہر بھوپال کا حکمران ہوگا۔ انہوں نے یہ قانون حکومت سے منسوخ کروالیا۔ یوں وہ بھوپال کی باقاعدہ حکمران بنیں اور ان کی بیٹی شاہ جہاں ولی عہد مقرر ہوئیں۔

1857ء کی جنگ آزادی میں تمام ہندوستان مشکلات کی زد میں تھا۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت عروج پر تھی مگر نواب سکندر کی حکمت عملی سے بھوپال میں کوئی ہنگامہ برپا نہ ہوا۔ نواب سکندر بیگم نے اپنے عہد حکومت میں دور رس فوجی و انتظامی اصلاحات کیں، دفتروں کو از سر نو مرتب کیا، ریاست کو تین حصوں میں تقسیم کیا، ہر حصے پر ایک ناظم مقرر کیا۔ انہوں نے ریاست کا تمام قرض اتار دیا، اکثر اپنی ریاست کا دورہ کرتی رہتیں اور لوگوں کی شکایات سن کر ان کی دادرسی کرتیں۔ اپنی والدہ قدسیہ بیگم اور ایک ہزار ہمراہیوں کے ساتھ حج بیت اللہ بھی ادا کیا۔ انہوں نے ''موتی مسجد'' کے نام سے ایک عظیم الشان مسجد بھی تعمیر کروائی۔

انہوں نے اپنی ولی عہد نواب شاہ جہاں بیگم کی شادی نواب باقی محمد خان سے کر دی۔ دو کروڑ حق مہر مقرر ہوا۔ اس شادی پر اس وقت کے آٹھ لاکھ روپے صرف ہوئے۔ جب یہ لوگ حج سے واپس آئے ان کے داماد نواب باقی محمد خان انتقال کر گئے انہوں نے اپنے پیچھے ایک بیٹی سلطان جہاں بیگم چھوڑیں۔ نواب سکندر جہاں نے اپنی بیٹی اور نواسی کی تربیت خصوصی طور پر کی کیونکہ انہوں نے مستقبل کی ولیِ بھوپال بننا تھا۔ 30 اکتوبر 1865ء کو سکندر جہاں وفات پا گئیں۔ ان کا مقبرہ انہی کے بنوائے گئے باغ ''فرحت افزا'' میں ہے۔ ان کی وصیت کے مطابق مقبرے پر کوئی گنبد وغیرہ تعمیر نہیں کیا گیا۔

نواب شاہ جہاں بیگم 1868ء-1901ء

نواب شاہ جہاں بیگم اپنی والدہ کی وفات کے بعد 1868ء میں والی بھوپال بنیں۔ جب وہ آٹھ برس کی تھیں تب ان کے والد انتقال کر گئے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت ان کی والدہ نے بہت عمدہ طریقے سے کی۔

نواب شاہ جہاں بیگم انتہائی ہونہار تھیں حافظہ انتہائی قوی، ذہن تیز اور طبیعت میں آگے بڑھنے کا شوق تھا۔ چند ہی سال میں اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل کرلیا۔ ان علوم کے بہترین اساتذہ کی خدمات لی گئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن کی تفسیر کا علم بھی دیا گیا۔ ان کے فاضل اساتذہ میں ہمیں مولانا حیدر علی، (مصنف فقہہ الکلام، شاگرد شاہ عبدالعزیز دھلوی)، مولانا حسیب احمد، حاجی عبدالکریم انصاری شامل ہیں۔

نواب شاہ جہاں کے شوہر نواب باقی محمد خان شادی کے بارہ برس بعد وفات پا گئے۔ اس وقت شاہ جہاں صرف 29 برس کی تھیں۔ اس کے ڈیڑھ برس بعد ان کی والدہ نواب سکندر جہاں بھی وفات پا گئیں۔

نواب سکندر جہاں کے دور میں علامہ نواب محمد صدیق حسن خان صاحب کا بطور ملازم ریاست میں تقرر ہوا تو نواب صاحب کے عمل و کردار انتظامی صلاحیت، اور حسن کارکردگی سے متاثر ہوکر نواب سکندر

جہاں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اگر شاہ جہاں بیگم کی شادی باقی محمد خان سے نہ ہوئی ہوتی تو میں صدیق حسن خان سے ان کا رشتہ کروادیتی۔

نواب صدیق حسن خان کا شمار تیرہویں صدی کے نمایاں ارباب علم وفضل میں ہوتا ہے۔مکتب کی تعلیم کے بعد صرف ونحو اور منطق کا علم حاصل کیا۔مشکوٰۃ المصابیح،مختار کانپیہ،شرح جامی قطبی میر قطبی،افق المبین پڑھیں۔اس دور کے جید علماء سے علم حاصل کیا۔بہادر شاہ ظفر اور انکے ولی عہد مرزا فخرو سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔

مرزا غالب کی صحبت میں بھی وقت گزارا۔دلی میں ان کا قیام نواب مصطفیٰ خان شفتہ کے مکان پر رہا۔اکیس برس کی عمر میں تلاش روزگار کے سلسلے میں بھوپال پہنچے۔یہ نواب سکندر کا زمانہ تھا۔انہوں نے وزیر اعظم جمال الدین کی سفارش پر انہیں تیس روپے ماہانہ پر منشی مقرر کردیا۔کچھ مدت بعد میر دبیر کے عہدے پر تقرر ہوگیا۔پھر ریاست کی تاریخ لکھنے کا کام انہیں سونپ دیا گیا اور پچھتر روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔جمال الدین ان کی لیاقت،قابلیت،خاندانی شرافت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی بیوہ بیٹی ذکیہ کا نکاح ان سے کردیا۔

اسی زمانے میں انہیں حج کی سعادت نصیب ہوئی۔مکہ معظّمہ میں انہوں نے تفسیر،حدیث،فقہ،تاریخ،اخلاق،تصوف کی نادر کتابوں کے نسخے خریدے اور انہیں اپنے ہاتھوں سے نقل کیا۔ان تمام کتب کے تراجم کرواکر تمام کتب خانوں میں ایک ایک نسخہ رکھوایا۔

حج سے واپسی پر نواب شاہ جہاں بیگم نے انہیں سررشتہ تعلیمات کے مدارس کا افسر اعلیٰ مقرر کردیا اور 1870ء میں ان سے عقد ثانی کرلیا۔نواب صاحب کو حکومت برطانیہ کی منظوری سے ''نواب والا جاہ امیر الملک'' کا خطاب ملا۔والیان ملک کی طرح ان کے لئے سترہ توپوں کی سلامی منظور ہوئی۔نواب شاہ جہاں نے ان کو پچھتر ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر عطا کی اور سرکاری مراسلوں میں ان کے لئے مختلف القاب و آداب مقرر کئے گئے۔

نواب صاحب اور بیگم صاحبہ نے نہایت خوشگوار ازدواجی زندگی گزاری نواب شاہ جہاں نے اپنے فاضل شوہر سے بلوغ المرام،مشکوٰۃ شریف اور شارق الانوار بھی پڑھ ڈالیں۔مگر نواب صاحب کی زندگی نے زیادہ وفا نہ کی اور 1890ء کو ساٹھ برس کی عمر میں وفات پا گئے۔یوں نواب شاہ جہاں نے بیس سال نواب صدیق حسن کی بہترین رفاقت میں گزارے۔

نواب شاہ جہاں نہایت علمی ادبی ذوق رکھتی تھیں۔اردو،عربی، فارسی پر عبور تھا،شعر وسخن سے بھی دلچسپی تھی۔خود بھی شعر کہتی تھیں۔تقویت الایمان (سید احمد شہید) ضمان الفردوس (سید احمد شہید) کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر رکھا ہوا تھا۔بھوپال میں بہت سے مطابع جاری کئے بلکہ مطبع شاہجہانی کو کتابوں کیلئے مخصوص کردیا۔

ان کا طرز معاشرت پرانی وضع کی ہندوستانی بیگمات کی طرح سادہ تھا۔لباس بھی متوسط طبقے جیسا پہنتیں،ریشمی کپڑا پسند نہ تھا،رنگا رنگ زیورات کی بھی شوقین نہ تھیں۔کھانا بھی سادہ پسند کرتیں۔آواز رعب دار تھی مگر انداز دل نشین تھا۔بڑی ملائمت اور نرمی سے گفتگو کرتیں۔ فیاضی اور سخاوت سے اللہ تعالیٰ نے بہرہ مند فرمایا تھا۔اہل علم وہنر کی بڑی قدر دان تھیں۔ایک مرتبہ ایک کاتبہ نے ایک پنج سورہ لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا تو بہت خوش ہوئیں اور کاتبہ کو مرصع پہنچیوں کی ایک جوڑی انعام میں دی۔

مذہبی امور وفرائض کی بڑی سختی سے پابندی کرتیں۔نماز کبھی قضا نہ ہوئی،گھر کی مسجد میں نماز ادا کرتیں۔جمعہ محل کی مسجد میں اور عید،عید گاہ میں پڑھتیں۔حصن حصین اور حزب الاعظم کا ورد جاری رکھتیں۔نیک اور خوف خدا رکھنے والی تھیں۔نواب صدیق حسن سے شادی کے بعد لکھنے کی طرف رجحان ہوا۔آپ نے بہت سی کتب لکھیں جن میں ''تاج الاقبال'' (بھوپال کی تاریخ) ''خزینۃ اللغات'' ''تہذیب نسواں وتربیۃ الانسان'' ''تنظیمات شاہ جہانیاں'' ''تاج الکلام'' ''دیوان شیریں'' ''مثنوی صدیق الیبان'' (فلکیات وجغرافیہ کے متفرق مضامین پر مشتمل) شامل ہیں۔

نواب باقی خان سے نواب شاہ جہاں کی دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ سلیمان جہان اور سلطان جہان۔سلیمان جہان صغرسنی میں چیچک کی وبا

سے فوت ہوگئیں ۔سلطان جہاں اپنی والدہ کے عقد ثانی تک جوان تھیں ۔ بدقسمتی سے نواب شاہ جہاں کو شبہ تھا کہ ان کی بیٹی سلطان جہاں نے اپنے سوتیلے باپ صدیق حسن کے خلاف سازشوں میں حصہ لیا ہے جس کی وجہ سے صدیق حسن کو انگریز حکومت کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ چنانچہ وہ بیٹی سے ایسی ناراض ہوئیں کہ ان کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہ تھیں ۔ بول چال ملنا جلنا سب ترک ہوگیا۔ آخر دم تک بیٹی سے ان کا دل صاف نہ ہوا۔

نواب شاہ جہاں نے ریاست کی آبادی کیلئے بہت کوششیں کیں ۔ اس سلسلے میں انہوں نے شہر بھوپال کے باہر شاہ جہاں آباد تعمیر کروایا۔ جس پر بیس لاکھ روپے خرچ ہوئے ۔ان کے عہد میں بھوپال علوم وفنون کا بڑا مرکز بن گیا۔انہوں نے اہل علم وفضل، اصحاب ہنر وکمال کی تربیت پر خصوصی توجہ کی اور ارباب علم وہنر کی قدر دانی میں خزانوں کے منہ کھول دیئے ۔ یہاں ہند کے نواح کے علاوہ دور دراز کے ملکوں سے بھی لوگ علم حاصل کرنے آتے تھے ۔ان کے دور میں تفسیر وحدیث کی نایاب کتب شائع ہوئیں ۔ان میں تفسیر ابن کثیر، فتح الباری، شرح صحیح بخاری اور امام شوکانی کی نیل الاوطار خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔عربی کی امہات کتب جمع کیں اور ایک لاکھ روپیہ خرچ کر کے تفسیر وحدیث کی نایاب کتب شائع کروائیں ۔

فلاحی کاموں میں فوج اور سپاہیوں کی تنخواہیں بڑھائیں، مصنوعی جھیلیں اور ڈیم تعمیر کروائے ۔ ریاست کی آمدنی بڑھانے کیلئے متعدد اقدامات کئے ڈاک کی پہلی مہر 1876ء اور 1878ء میں جاری کی گئی ۔غلہ پر محصول معاف کردیا 1901ء میں نواب شاہ جہاں بیگم نے وفات پائی ۔

سلطان جہاں بیگم 1901ء-1926ء:

اپنی والدہ شاہ جہاں کی وفات کے بعد بھوپال کی حکمران بنیں ۔ 1858ء میں پیدا ہوئیں ۔ان کی شادی 1874ء میں احتشام الملک نواب عالی جاہ احمد علی خان افغان رئیس میرانزئی خیل سے ہوئی ۔اللہ تعالیٰ نے انہیں پانچ بچے عطا کئے، تین بیٹے اور دو بیٹیاں، صاحبزادی بلقیس جہاں مظفر بیگم، کرنل علی جان نواب حافظ سر نصر اللہ خان، میجر جنرل محسن الملک نواب حافظ مجید اللہ خان ، صاحبزادی آصف جہاں بیگم، سکندر رصولت افتخار الملک حافظ حمید اللہ خان (چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی)

مسند نشینی کے چھ ماہ بعد نواب صاحب وفات پا گئے ۔بیگم صاحبہ کے ساتھ ستائیس سالہ رفاقت کا دور بہت خوشگوار گزرا۔انہوں نے شوہر کی وفات کا صدمہ بہت بہادری سے برداشت کیا اور اپنی پوری توجہ ریاست کے کاموں میں مرکوز کردی ۔اپنے شوہر کی وفات پر انہوں نے جن الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے وہ الفاظ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں ۔انہوں نے اپنے غم زدہ جذبات کے اظہار کے بعد سورۃ بقرہ کی آیت (57) کی تلاوت کی ۔

ترجمہ: ''ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے ۔تو صبر کرنے والوں کو خدا کی خوشنودی کی بشارت سنادو۔ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں ہم خدا ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ۔یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی رحمت اور مہربانی ہے اور یہی سیدھے راستے پر ہیں ۔''

اور کہا کہ مجھ پر جو عین مشکلات کے وقت یہ سخت حادثہ گزرا وہ در اصل میرے صبر کا امتحان تھا۔ میں نے خدا کی مرضی پر صبر کیا اور قضائے الٰہی کے سامنے سر جھکا کر آیت کریمہ ''حَسْبُنَا اللّٰہِ وَ نِعْمَ الْوَکِیْل نِعْمَ الْمَوْلٰی وَ نِعْمَ النَّصِیْر'' ورد زبان بنایا جو میرے دل کو اطمینان دیتی ہے کیونکہ خدائے عزوجل فرماتا ہے ''اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب''

نواب سلطان کا عہد طفلی ان کی نانی نواب سکندر بیگم کے ہاں گزرا انہوں نے نہایت شفقت ومحبت سے اپنی نواسی کی تربیت کی ۔ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے کبھی زندگی بھر نماز قضا نہ کی اور نہ ہی نماز کے بعد تلاوت قرآن کا ناغہ کیا۔قرآن کریم سے انہیں دلی لگاؤ اور تعلق تھا ہر سال ہزاروں کی تعداد میں قرآن مجید نادار طلبہ اور مسلمانوں میں تقسیم کرتیں تجوید اور قرأت کے فن کو فروغ دینے کیلئے انہوں نے بھوپال میں مدرسۂ حفاظ قائم کیا۔اپنے ایک فرزند صاحبزادہ عبید اللہ خان کو قرآن حفظ کروایا۔

انہوں نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو مولوی جمال الدین سے جو انکے اس وقت وزیر اعظم تھے، قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر پڑھا۔ وہ اپنے دور کے بہت بڑے عالم دین بھی تھے۔ اس کے علاوہ انہیں اردو عربی فارسی اور انگریزی کی تعلیم بھی دی گئی۔ امور خانہ داری، شہ سواری اور نشانہ بازی میں بھی طاق تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ فن خطاطی میں بھی ماہر تھیں۔

فرائض یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ پردے کی بھی سخت پابند تھیں، عمائد حکومت ہوں یا ماتحت ملازمین، ہم عصر والیان ریاست ہوں یا دوسرے ملکوں کے فرمانروا گورنر ہوں یا وائسرائے وہ ان سے ملاقات کے وقت ہمیشہ مستور رہتیں زندگی کے آخری سال میں انہوں نے قرآن پاک کی رخصت سے فائدہ اٹھا کر پردہ ترک کیا لیکن وہ بھی صرف چہرے کی حد تک۔ اس وقت ان کی عمر اکہتر برس تھی۔

بھوپال کی تاریخ جن کتب میں رقم ہے ان میں ان کی بہت سی تصاویر شامل ہیں جن میں ''وائسرائے ہند کے ساتھ'' ''اپنے مشیروں کے ساتھ'' ''پرنس آف ویلز اور اپنے حفاظتی دستے کے ہمراہ'' اور یورپ کے دورے کے دوران لی جانے والی تصاویر میں وہ مکمل چہرے کے پردے کے ساتھ دکھائی دیتی ہیں۔

عنان حکومت سنبھالنے کے ایک سال بعد حج بیت اللہ کیا وہاں چھ ماہ رہیں، واپسی پر انہوں نے سفر حج کا حال اپنی کتاب ''ریاض الراحین'' میں بڑے شوق سے لکھا۔

جس وقت انہوں نے اقتدار سنبھالا خزانے میں صرف چالیس ہزار روپے تھے۔ انہوں نے تمام شعبوں کی از سر نو اصلاحات کیں۔ ایسے دور اندیشانہ اقدامات کیے جس سے خزانے میں اضافہ ہوا اور رعایا بھی خوشحال ہوگئی۔ انہوں نے ریاست کی بہتری کیلئے ہر جگہ خود جا کر حالات کا معائنہ کیا اور لوگوں کے مسائل سنے اور انہیں دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی وہ ریاست کے دوروں پر جب بھی جاتیں اپنے بیٹوں کو ہمراہ رکھتیں تاکہ وہ امور ریاست سے واقف ہوسکیں۔

1911ء میں انہیں جارج پنجم کی تاجپوشی کے موقع پر لندن سے خصوصی دعوت نامہ ملا۔ ریاست کے تمام انتظامات اپنے بڑے بیٹے سر نصر اللہ خان کے سپرد کر کے اپنے دوسرے بیٹے عبید اللہ، اس کی دلہن شہر یار، حمید اللہ خان اور میمونہ دلہن کے ہمراہ یورپ گئیں۔ سخت سردی کے دن تھے اتنی سردی میں بھی انہوں نے نماز قضا نہ کی اور نہ ہی تلاوت قرآن کا ناغہ کیا۔ انہوں نے اپنے سیکرٹری کو حکم دے رکھا تھا کہ کسی پارٹی یا ملاقات کا وقت ایسا مقرر نہ کیا جائے جس میں نماز کے قضا ہونے کا اندیشہ ہو۔ انہوں نے یورپ کا تمام دورہ پردے سمیت کیا۔ تاج پوشی کی تقریب میں بھی وہ برقعے سمیت شامل ہوئیں۔ انہیں وہاں جو ایوارڈ دیئے گئے وہ بھی انہوں نے پردے کے ساتھ ہی وصول کئے۔

یورپ کے دورے کے دوران وہ لندن، پیرس، جرمنی کے علاوہ استنبول گئیں اور وہاں کے فرمانروا مہمت ریشاد سے ملاقات کی۔ ہنگری، اٹلی اور مصر کے دورے بھی کئے ان دوروں میں طاعون اور چیچک جیسی موذی بیماریوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ وہاں کے تعلیمی نظام پر ریسرچ کی۔ بھوپال واپس آ کر انہوں نے وبائی امراض کی روک تھام کیلئے ویکسین کو متعارف کروایا تاکہ عوام میں بڑے پیمانے پر ہونے والی بیماریوں اور اموات کو روکا جا سکے اور حفظان صحت کے اصولوں کو بھی عوام میں متعارف کروانے پر بھرپور زور دیا۔

انہوں نے فوج، پولیس، عدلیہ اور جیل کے نظام کو از سر نو مرتب کیا، ٹیکس کے نظام کی اصلاح کی، زرعی اصلاحات کیں، بہت سے ٹیکنیکل سکول اور ادارے بنائے 1918ء میں پوری ریاست میں پرائمری تک مفت تعلیم لازمی قرار پائی۔

نواب سلطان جہاں بیگم کا دست سخاوت بہت کشادہ تھا۔ وہ ریاست اور بیرون ریاست بہت سے علمی اداروں اور ارباب فضل و کمال کی فراخدلی کو وہ بہترین درسگاہ سمجھتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے صاحبزادے حمید اللہ خان کو انگلستان یا اجمیر کے چیفس کالج میں بھیجنے کی بجائے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھیجا اور انہوں نے وہیں پر اپنی تعلیم مکمل کی۔ علی گڑھ میں انہوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر دفتر کی عظیم الشان عمارت تعمیر کروائی۔ اس عمارت کا نام انہیں کے

نام پر ''سلطان جہاں منزل'' رکھا گیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کے کچھ عرصہ بعد وہ وہاں کی وائس چانسلر مقرر ہوئیں اور تا حیات وائس چانسلر رہیں اور اس ادارے کو گرانقدر امداد دیتی رہیں۔

بھوپال کے شاہی خاندان نے علی گڑھ تحریک میں ہمیشہ ساتھ دیا۔ وہ سرسید احمد خان کی اس تحریک کی بہت بڑی حامی تھیں۔ انہوں نے محمڈن اورینٹل کالج کی جامع مسجد کیلئے دس ہزار روپے کی امداد دی۔ سرسید احمد خان کی وفات کے بعد یونیورسٹی کے سیکرٹری نواب وقار الملک اور بیگم سلطان جہاں نے باہمی اتفاق سے کالج کو سنبھال لیا۔ بھوپال خاندان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے چھوٹے صاحبزادے حمید اللہ خان علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر بنے۔ انہوں نے یونیورسٹی کی عمارت اور دیگر اخراجات کیلئے خطیر رقم دی۔

بیگم نواب سلطان کا طرز رہائش بہت عمدہ تھا۔ گھر کا تمام فرنیچر یورپین سٹائل کا تھا۔ اپنے محل کے علاوہ دو کمپلیکس مہمانوں کیلئے وقف تھے۔ قصر سلطان راج محل کمپلیکس کی تعمیر نو کی۔ مزید راحت منزل اور راج منزل کا بھی اضافہ ہوا۔

احمد آباد کا محل آج کا سلفیہ کالج ہے جو بھوپال کی پرانی درسگاہ ہے۔ ایک محل نور الصبا کے نام سے بنوایا جہاں آج کل پرسٹیج ہوٹل ہے۔ منٹو ہال کی تعمیر کروائی جس میں دربار لگایا جاتا تھا۔ بعد میں اسکا نام ''ودھان سبھا'' رکھ دیا گیا۔ سلطانیہ گرلز ہائی سکول، رفیقیہ گرلز ہائی سکول، کنگ جارج ہسپتال جسکا نام بعد میں ''حمیدیہ ہسپتال'' رکھا گیا۔ یہ بھوپال کا وہ واحد ہسپتال تھا جس میں ایکسرے مشین تھی۔

بیگم سلطان جہاں 1914ء میں آل انڈیا مسلم خواتین کی ایسوسی ایشن کی صدر بنیں۔

نواب سلطان جہاں کو سرور عالمؐ سے بے پناہ عقیدت اور محبت تھی 1920ء میں جب علامہ شبلی نعمانی نے سیرت النبیؐ لکھنے کا ارادہ کیا تو مالی مشکلات آڑے آگئیں۔ انہوں نے قوم سے پچاس ہزار روپیہ فراہم کرنے کی اپیل کی نواب سلطان جہاں کو معلوم ہوا تو انہوں نے یہ تمام رقم اپنے پاس سے دے دی اور علامہ شبلی نعمانی کو دوسرے تمام آستانوں سے بے نیاز کر دیا۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی یکسوئی سے اس کام میں مشغول ہو گئے۔ ابھی وہ اسکا پہلا حصہ ہی مرتب کر پائے تھے کہ پیغام اجل آ پہنچا بعد میں ان کے شاگرد سید سلیمان ندوی نے اس کام کو مکمل کیا۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو بیگم صاحبہ نے اسے دیکھ کر مسرت سے فرمایا۔ ''یہ تو بڑا کام ہوا۔''

اس موقع پر سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب ''سیرۃ عائشہ'' مولانا عبد السلام ندوی کی 'سیرۃ الصحابہ'' اور اس سلسلے کی دوسری کتابوں کے مسودات کا ذکر کیا اور دار المصنفین اعظم گڑھ کا ذاتی پریس نہ ہونے پر ان کتابوں کی اشاعت میں جو مشکلات آ رہی تھیں ان کا اظہار کیا تو بیگم صاحبہ نے دریافت فرمایا، ''پریس کی کیا قیمت ہوگی؟'' مولانا نے جواب دیا ''تین ہزار روپے'' بیگم صاحبہ نے کہا ''ایسے نیک کام کیلئے تین ہزار کیا چیز ہیں۔'' فوری طور پر پیسے ادا کر دیئے۔

نواب سلطان بڑی خدا ترس اور عدل پرور حکمران تھیں۔ عدلیہ کے افسروں کو حکم تھا کہ فیصلہ کرتے وقت، احکام الٰہی کو پیش نظر رکھیں اور پورا پورا انصاف کریں۔

1926ء میں جب ان کی عمر اڑسٹھ برس کی ہوگئی تو وہ مسند نشینی سے اپنے صاحبزادے حمید اللہ خان کے حق میں دستبردار ہو گئیں۔ نئے حکمران کی مسند نشینی کے وقت جو دربار منعقد ہوا اس میں انہوں نے بہترین تقریر کی۔ رعایا کی بھلائی کیلئے ممکنہ کوششوں کا ذکر کیا آخر میں نئے حکمران کو مخاطب کر کے قرآن کی آیات کی تلاوت کی جن میں عدل و احسان کرنے، غریبوں، یتیموں، حاجت مندوں اور مسافروں کی دستگیری کرنے، فحش منکر اور سرکشی سے باز رہنے، نماز قائم کرنے، عہد و پیمان کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر مسند نشینی کی رسم ادا کی گئی بیگم صاحبہ نے ہاتھ اٹھا کر سورہ احقاف کی آیت 15 پڑھی۔

ترجمہ: ''اے میرے پروردگار مجھے توفیق دے کہ تو نے جو احسان مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کئے ہیں ان کی شکر گزار بنوں اور یہ کہ نیک عمل کروں جن کو تو پسند کرے اور میرے لیے میری اولاد کی اصلاح کر دے میں تیری طرف رجوع کرتی ہوں اور میں فرمانبرداروں

میں سے ہوں۔''

یہ دعا کرتے وقت،ان پر رقت طاری تھی اور حاضرین بھی بچشم نم تھے۔

اس کے چار سال بعد1930ء میں اپنے وقت کی یہ عظیم خاتون دنیائے فانی سے کوچ کر کے دارالبقا میں پہنچ گئیں۔ دنیا کے تمام مسلمانوں نے ان کی وفات پر سخت رنج والم کا اظہار کیا۔ ملک کے تمام وقیع اخبارات و رسائل نے تعزیتی اداریے لکھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں ''والیۂ بھوپال سلطان جہاں بیگم خادمۂ ملت و مخدومہ امت کا ماتم'' کے عنوان کے تحت اپنے جو تاثرات قلمبند کئے ان سے مرحومہ کے مقام اور مرتبہ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔

''علیا حضرت کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جس کا ماتم نہ صرف بھوپال، نہ صرف ہندوستان نہ صرف مسلمان بلکہ تمام دنیا کر رہی ہے۔ وہ نہ صرف اسلام کی بلکہ مشرق کی وہ آخری تاجدار خاتون تھیں جن کے کارناموں پر سلاطین اور امراء بھی رشک کر سکتے ہیں۔ ان کا دور حکومت بھوپال کی تاریخ کا زریں عہد ہے۔''

''سلطانہ مرحومہ مشرقی و مغربی تعلیم و تمدن کا ایسا مجمع البحرین تھیں جو آج مصلحین امت کا آئیڈیل ہے۔ ان کی مشرقی تعلیم پوری اور مغربی واقفیت بقدر ضرورت تھی۔ وہ نہ صرف فرمانروا تھیں بلکہ ہندوستانی خواتین کی رہنما، مسلمانوں کی واحد یونیورسٹی کی علیا رئیسہ مذہبی تعلیم کی سب سے بڑی حامی، مذہبی علوم وفنون کی سب سے بڑی سرپرست، ہندوستان کی معتدل نسوانی اصلاحات کی سب سے بڑی مبلغ، مسلمان عورتوں میں سب سے بڑی کثیر التصانیف اور سب سے بہتر مقررہ تھیں۔''

''وہ ہر قومی مذہبی اور علمی تحریک پر سب سے پہلے لبیک کہتیں اور اس کے لئے عملی قدم اٹھاتیں۔ مسلم یونیورسٹی مدرسۂ دیوبند، دارالعلوم ندوہ اور ورکنگ مشن چھوٹے بڑے بیسیوں تعلیمی و مذہبی ادارے ان کی امداد اعانت کے طوق منت سے گرانبار ہیں۔ دارالمصنفین کی انہی کے دست کرم سے بنیاد پڑی۔''

سلطانہ مرحومہ کی ہستی میں رعب و شفقت کی عجیب آمیزش تھی اور ان کے اخلاق میں عجیب کشش تھی۔ ان کا دربار حد درجہ سادہ ہوتا۔ دربار کے آداب بھی تمام تر شرعی تھے۔ پردہ کے پیچھے وہ تشریف رکھتی تھیں۔ کورنش و تسلیمات و رکوع و سجود کا وہاں دخل نہ تھا۔ سب سے پہلے السلام علیکم کی بلند آواز ان کی طرف سے آتی تھی۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ان سے مل کر ان کے اخلاق اور ہمہ دانی سے متاثر نہ ہوا ہو۔ علامہ شبلی مرحوم غالباً1906ء میں ان سے ملے تو ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے جذبات ''الندوہ'' میں یوں ظاہر کیے ہیں۔ ''مجھے دو تین مرتبہ ان کے حضور باریابی کا شرف حاصل ہوا مگر ہر دفعہ دیر تک وہ اس اخلاق سے مصروف کلام رہیں کہ مخاطب یہ بھول جاتا تھا کہ وہ کسی خودمختار فرمانروا سے بات کر رہا ہے۔ ان کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا اور اس کے لئے ایک خاص محکمہ بنایا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے مسودات بارہا دیکھے۔ ان کے برمحل اعتراض اور باموقع سوجھ بوجھ حیرت انگیز تھی۔ اپنی تصنیفات کے مسودوں پر خود نظر ثانی کرتیں اور اپنے قلم سے ان پر نشان بناتیں۔''

''ان کو رسول پاکؐ سے بے مثال عقیدت تھی جس کی کھلی دلیل خود سیرۃ النبیؐ کا وجود ہے مگر اسکے علاوہ ان کی گفتگو، تحریر ہر چیز سے ان کا یہ جذبہ ظاہر ہوتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں سیرۃ النبی کی پہلی جلد لے کر جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو بڑے اشتیاق سے انہوں نے دریافت کیا کہ عالم رویا میں رسول کریمؐ کی زیارت کس طرح ہوسکتی ہے، عرض کی کہ کتب حدیث و سیرتؐ کے مطالعہ اور درود و سلام کی کثرت سے۔''

نواب سلطان جہاں بیگم کی پچاس کے قریب تصانیف موجود ہیں جن میں بیشتر کا موضوع مذہب، خانہ داری اور اخلاق ہے ان میں سے چند اہم اور مشہور تصانیف کے نام یہ ہیں۔ ''سیرت مصطفیٰؐ، سیرت شاہ جہانی، ریاض الراحیین، تزک سلطانی، گوہر اقبال، خورشید اقبال۔''

استفادہ:۔ تاریخ اسلام کی چار سو با کمال خواتین از طالب ہاشمی، تہذیب نسواں و تربیۃ الانسان از نواب شاہ جہاں بیگم، (نظر ثانی ایڈیشن از ام عبد منیب) انٹرنیٹ۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

محرم آ گیا ہے

محرم ہر سال آتا ہے اور ہر مسلمان اسے اپنے طریقے سے مناتا ہے یا اس سے کچھ حاصل کرتا ہے۔

آخر محرم میں ایسی کیا بات ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی اسکی یاد اور آب و تاب میں کمی نہیں آئی بلکہ ہر سال پہلے سے زیادہ لوگ مل کر امام مظلوم حسین ابن علی اور انکے ساتھیوں کی شہادت کا غم مناتے ہیں؟ محرم دراصل اسلام کا وہ پیغام ہے جو ساری کائنات ساری انسانیت کیلئے ہے۔

؎ انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

دنیا جب سے بنی ہے یہاں خیر اور شر کی جنگ جاری ہے قابیل کا ہابیل کو حسد کی بنا پر قتل کر دینا اس کی ابتدا تھی۔

چنانچہ جہاں جہاں ظلم، استحصال، جبر، ناانصافی، اور شر ہوگا وہاں وہاں مظلوموں کے ساتھ امام حسینؑ بھی کھڑے دکھائی دینگے کہ ظلم کے آگے سر نہیں جھکانا، اسکا مقابلہ کرنا ہے، اس کو مٹانا ہے، اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کو نافذ کرنا ہے۔

واقعہ کربلا کو آپ غور سے پڑھیں یا سنیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ حق پر قائم رہنا، پھر اسکے راستے میں جو بھی تکلیف، آرام، بھوک، پیاس، جدائی، قربانی، قید برداشت کرنی پڑے اسے صبر تسلیم و رضا حوصلہ، شجاعت، وقار، معافی، درگزر، محبت، بڑوں کی عزت اور چھوٹوں سے پیار، خودداری، عدل اور مکمل یقین اور غیر متزلزل ایمان کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتے چلے جائیں۔ اس نکتہ نظر سے دیکھیں تو واقعہ کربلا ایک تربیت کا ادارہ ہے کہ مخالف فریق یا دشمن جو بھی کرے یا کہے آپ نے غصہ نہیں کرنا صبر کرنا ہے، استقامت دکھانی ہے۔ کیسی ہی آزمائش ہو آپکے پائے استقلال میں جنبش نہ آئے یہ تبھی ہوسکتا ہے کہ آپ کو اپنے فیصلے اور راستے کی صداقت کا یقین ہو۔

آغوش رسالت سے تربیت پانے والے نواسۂ رسولؐ سے بڑھ کر کس کا ایمان اور صداقت بلند پایہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ انکے اس یقین پر سارے مسلمانوں کو اعتماد ہے اس لئے ہر سال سارے مسلمان اس پیغام سے سبق سیکھتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تربیت کے لحاظ سے پہلی قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو امام حسین ابن علیؑ کے کردار میں ڈھالنا ہے۔

سرفہرست ایمان ہے، ہر حال میں پروردگار عالم کی رحمت سے امید رکھنا اسکی مدد پر یقین رکھنا اور حق کے لئے جہاد کرنا۔

یہ ہم تبھی کر سکتے ہیں جب ہم نے اپنے نفس کو اللہ پاک کے احکام کے تابع کر لیا ہو اور ہمارا کا نفس یا شیطان ہمیں گمراہ نہ کرنے پائے دنیا کی چکاچوند یا اقتدار کسی قسم کا کوئی دباؤ قبول نہ کریں۔

اپنے نفس کی اطاعت نہ کریں بلکہ نفس کو اللہ تعالیٰ اور رسول پاکؐ کے تابع کر لیں۔

اسکے لئے پہلی چیز ہے کہ ہم غصہ نہ کریں۔ اپنے مزاج پر پورا کنٹرول ہونا چاہئے کیونکہ جب غصہ آجاتا ہے تو عقل چلی جاتی ہے۔ پھر انسان کو پتہ نہیں چلتا کہ اسکی زبان سے کیسے لفظ ادا ہو رہے ہیں۔ بعد میں پشیمانی اور ندامت ہوتی ہے۔ غصہ کرنے والا اپنے آپ کو خود ہی تباہ و برباد کر لیتا ہے۔ اسکے اپنے پرائے اس کو پسند نہیں کرتے، اس سے دور ہو جاتے ہیں۔ وہ انسان غصے میں غلط فیصلے کرتا ہے جس کی وجہ سے اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگی برباد کر لیتا ہے۔

''ذرا سی ناگوار بات پر چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جسکے

پیچھے دکھ ہو‘ (القرآن)۔

غصے کے وقت اپنے مزاج، زبان اور ہاتھوں پر کنٹرول رکھنا ہی صبر کہلاتا ہے۔قرآن پاک میں ان لوگوں کو کاظمین (یعنی غصہ ضبط کرنے والے کہا گیا ہے) کربلاوالے صبر کا روشن مینار دکھائی دیتے ہیں۔اپنے مخاطب کی بات پر سیخ پا نہ ہونا اور حکمت سے اسکا جواب دینا ہی انسان کواعلیٰ اخلاق کے مرتبے پر فائز کرتا ہے۔

مسجد نبوی ہے،صحابہ تشریف رکھتے ہیں ایک نوجوان آتا ہے اور آکر حضرت سلمان فارسیؓ کو مذاق سے مخاطب کرتا ہے کہ اے سلمان تیری داڑھی کے بال بہتر ہیں یا کتے کی دم کے بال اچھے ہیں۔آپ بالکل غصہ نہیں کرتے بلکہ بڑے تحمل سے جواب دیتے ہیں کہ ایک دن مجھے مرنا ہے اس کے بعد یوم حشر ہوگا اور میری نیکیوں اور برائیوں کا وزن کیا جائیگا اگر میری نیکیاں برائیوں سے زیادہ نکلیں تو میری داڑھی کے بال بہتر ہیں اور اگر برائیاں زیادہ نکلیں تو کتے کی دم کے بال بہتر ہیں۔

اتنے جلیل القدر صحابی کا یہ جواب میں پڑھ کر دنگ رہ گئی کہ اتنا صبر،حوصلہ اور کیسی حکمت ہے جواب میں.....غور کریں ورنہ دنگا فساد ہو جاتا کہ کتنا بے ہودہ سوال ہے لیکن وہاں غصہ نہیں علم،عقل اور حکمت کام کر رہی تھی اور یہ قربت رسولؐ کا اثر تھا۔جو شخص اپنے مخاطب کی بُری سے بُری بات سن کر صبر اور حکمت سے اسکا جواب دیتا ہے وہ دنیا کا کامیاب ترین شخص ہے۔دنیا میں لڑائی،فساد،قتل،ناراضگی،طلاقیں، جدائیاں،دشمنی کی تہہ میں یہی غصہ اور اشتعال کارفرما ہوتا ہے۔

اس لئے دنیا میں جینے کیلئے رہنے کیلئے اور کچھ بھی کرنے کے لئے سب سے پہلے اپنی تربیت کیجئے تاکہ ہم اپنے لئے اپنے خاندان دوستوں معاشرے ملک وقوم کیلئے فائدے کا سبب بن سکیں اس دنیا کے حسن میں اضافہ کرسکیں۔

حضرت علیؓ جنگ میں مصروف ہیں ایک کافر کے سینے پر سوار ہیں قریب ہے کہ اسکا سر قلم کردیں،کہ وہ نابکار آپ کے منہ پر تھوک دیتا ہے آپ غصہ کرنے کی بجائے فی الفور اسکے سینے سے اتر جاتے ہیں اسے قتل نہیں کرتے وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔جواب ملتا ہے،میں تجھے اللہ کا دشمن سمجھ کر قتل کر رہا تھا اب درمیان میں میرا نفس آ گیا یعنی تمہارے اس فعل پر مجھے غصہ آ گیا اب میں تم سے اسکا انتقام نہیں لونگا میں نے تمہیں معاف کردیا۔وہ آپ کے پاؤں پر گر گیا اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔

آپ اپنے اردگرد نظر دوڑائیں آپ کو کتنی ہی ایسی مثالیں نظر آئینگی کہ ذرا سی بات تھی مگر غصے نے ایک برے انجام تک پہنچا دیا۔چنانچہ سب سے پہلے بلکہ آج سے ہی اپنے دل میں عہد کریں کہ غصہ نہیں کرنا.....سوچ سمجھ کر بہترین اخلاق اور حکمت کا مظاہرہ کرنا ہے۔

دوسری بات سوئے ظن ہے قرآن پاک میں بدگمانی سے منع کیا گیا ہے بہت سے گمان گناہ ہوتے ہیں۔

محفل میں دو لوگ بات کر کے ہنس پڑتے ہیں ایک اور بیٹھا شخص دیکھ کر سوچتا ہے کہ انہوں نے میری بات کی ہے اب یہ گمان اسکے دل میں بیٹھ جاتا ہے اور اسکا رویہ یعنی عمل بدل جاتا ہے حالانکہ ہوسکتا ہے انہوں نے کوئی اور بات کی ہو۔

ہمیشہ سوئے ظن سے بچیں یہ ہوا میں تیر چلانے والی بات ہے اور ایمان کو بدگمانی دیمک کی طرح کھا جاتی ہے ہمیشہ یہ سوچیں کہ اللہ کی رحمت میرے ساتھ ہے اسکے ہوتے ہوئے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا بس بات ختم۔

زبان کے سلسلے میں حدیث پاک ہے کہ تم مجھے زبان کی حفاظت کی ضمانت دو میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

یہ آٹھ چیزیں ہیں۔

1۔ہمیشہ سچ بولو زبان کو کبھی جھوٹ سے آلودہ نہ کرو اللہ نے زبان اس لئے دی ہے کہ ذکر خدا کرو اور دین کی تبلیغ کرو۔

2۔کسی کی غیبت نہ کریں یہ بہت بڑا گناہ ہے اسے کبھی معمولی بات نہ سمجھیں آج کل سب سے زیادہ یہی گناہ سرزد ہو جاتا ہے فون یا ملاقات پر جب بھی کسی تیسرے کا ذکر بُرے الفاظ میں آئے گا ہم اس گناہ کے مرتکب ہوگئے۔

3۔کبھی کسی کو بددعا نہ دیں کیسا ہی ملال ہو یا اشتعال ہو صبر کریں۔

4۔ کبھی کسی پر لعنت نہ کریں۔

5۔ کسی کا مذاق نہ اڑائیں قرآن پاک میں فرمایا گیا کہ مرد مردوں کا اور عورتیں عورتوں کا مذاق نہ اڑائیں اس سے دل آزاری ہوتی ہے دشمنی پڑ جاتی ہے۔ خواہ مخواہ دوسرے کی ذلت اور رسوائی کا سامان ہو جاتا ہے اپنی زبان کو مذاق کا عادی نہ بنائیں کیونکہ اس سے انسان کی آبرو ختم ہو جاتی ہے ۔

6۔ وعدہ خلافی نہ کریں اول تو آپ کسی سے وعدہ ہی نہ کریں یہ آپ کا لوگوں پر احسان ہوگا اگر کرنا ہی پڑ جائے تو اس کو پورا کریں۔

7۔ اپنی تعریف کبھی نہ کریں اللہ تعالی نے فرمایا ۔فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (نفس کی پاکیزگی بیان نہ کرو وہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو جانتا ہے) اس لئے خود پسندی اور خود ثنائی نہ کریں۔

8۔ طعنہ، طنز، شکوہ اور گلہ نہ کریں کیونکہ اس سے مخاطب کو ایذا دینا مقصود ہوتا ہے اور اپنے نفس کی بڑائی مقصود ہوتی ہے یہ چیز عداوت کو جنم دیتی ہے اور دشمنی برے انجام تک لے جاتی ہے۔

آج کل دنیا سب سے زیادہ زبان کی آفات میں مبتلا ہے اسی لئے میں نے محرم کے عنوان کے تحت اپنی تربیت کا سب سے ضروری ستون بیان کیا ہے کہ آج کل بھی ہمارے ہر طرف کربلا کا ہی منظر دکھائی دیتا ہے۔ لازم ہے کہ ہم سب سے پہلے اپنی تربیت کریں۔ ہر شخص اگر اپنی زبان کی حفاظت میں مستعد ہو جائے تو نہ صرف ذاتی زندگی بلکہ معاشرے میں تبدیلی آئیگی ۔ یہ کبھی نہ سوچیں کہ آپ صبر کر کے اور معاف کر کے خسارے میں رہیں گے بلکہ اللہ تعالیٰ آپ کے گناہ معاف فرمائے گا مخاطب کی نیکیاں آپ کو ملیں گی اور آپ کے درجات بلند ہونگے ۔ شہدائے کربلا کا یہی پیغام ہے کہ حق اور امن قائم ہو جائے۔

☆......☆......☆

میری لائبریری سے

کتاب کا نام	روشن آبگینے
مرتبہ	روبینہ فرید
ناشر	تدوین تاریخ کمیٹی جماعت اسلامی حلقہ خواتین

جی قارئین السلام علیکم ورحمتہ اللہ..... چند ماہ کے بعد کالم لے کر حاضر ہوں بقول شاعر

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

باعث تاخیر تو بہت کچھ تھا، پہلے نمبر پر جسمانی صحت کی طرف سے کچھ مسائل درپیش رہے، رمضان کی مصروفیت اس سے ایک ماہ قبل شروع ہو جاتی ہے اور تھکاوٹ (ٹائیفائیڈ کی شکل میں) کئی ماہ تک نڈھال رکھتی ہے پھر.....اصل وجہ یہ کہ کتاب کا انتخاب بھی درحقیقت بہت مشکل کام ہے۔ ہر کتاب اس کالم کے لئے نہیں اٹھائی جا سکتی۔ کوئی کتاب قارئین کے ذوق پر گراں گذر سکتی ہے تو کوئی منتظمین کی طرف سے سوالیہ نشان بن سکتی ہے۔

لیکن الحمدللہ آج ہاتھ میں وہ کتاب ہے جو میری آپ کی اور سب کی مشترکہ پسند ہے۔ کتاب کا نام ''روشن آبگینے'' ہے اور یہ حلقہ خواتین جماعت اسلامی کی بنیاد رکھنے والیوں سے شروع ہو کر اس میں خون دل سے رنگ بھرنے والی ان عظیم ہستیوں کے حالات زندگی پر مشتمل ہے جو راہی ملک عدم ہوئیں۔ ہر طرح کی مشکلات میں اس تنظیم سے والہانہ لگاؤ رکھنے والیوں نے زندگی کیسے گذاری یہ ان مشکلات کو کس طرح face کرتی تھیں، عزم وتوانائی کیسے حاصل کرتی تھیں، وہ کون سا جادوئی ٹوٹکا تھا کہ یہ گھر محلّہ، شہر، تنظیم، سب سے مثالی تھیں۔ ہر ہستی ان صفات سے کیسے مالا مال تھی جو انسان کو عالی مرتبت بناتی ہیں یہ کتاب کے ہر صفحے بلکہ ہر سطر پر جگمگاتے پیروں کی شکل میں موجود ہے۔ اگر آپ عقیدے، عبادات، معاملات یا تنظیمی معاملات میں ''ضعف'' کا شکار ہیں تو کتاب اٹھا کر کوئی صفحہ کھول لیجئے، انشاء اللہ کتاب بند ہو گی تو کچھ کر گزرنے کا جذبہ دوبارہ تحریک پکڑ چکا ہو گا۔

یہ سب پاک طینت ہستیاں جس طرح زندگی گذار کر گئی ہیں اس کے لئے سینکڑوں نہیں ہزاروں صفحات کی ضرورت ہے لیکن کتاب کی مرتبہ روبینہ فرید نے بہت عمدگی سے ان سب کا نچوڑ اس طرح ان صفحات میں منتقل کیا ہے کہ ان کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے حلقہ خواتین کی کہکشاں کے ستاروں کی تعداد تو بے شمار ہے لیکن جن لوگوں کا انتخاب اس کتاب میں شامل ہے بلاشبہ یہ سب'' **فاستبقو الخیرات** '' پر عمل پیرا تھیں۔ ان کی نظریں آخرت پر اور عقیدہ پختہ تھا، زمین کے نمک کی حیثیت رکھنے والی چند خواتین روشنی کے قطب مینار ہیں ان سب کا اللہ سے تعلق مضبوط تھا، ان کی زندگیاں سادہ اور ریاکاری سے پاک تھیں۔

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں، مگر ایسے بھی ہیں

فہرست کا آغاز حمیدہ بیگم کے حالات زندگی سے ہوتا ہے جو جماعت اسلامی حلقہ خواتین کی پہلی سربراہ تھیں 1915ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد والدہ نے خواب میں دیکھا کہ کسی صاحب نے بچی کا پیٹ چاک کر دیا اور اس کا قیمہ بنا کر عوام میں تقسیم کر دیا تعبیر پوچھی تو بشارت ملی کہ یہ بچی علم دین میں مہارت حاصل کرے گی اور لوگوں کو اس سے بہرہ مند کرے گی (دعوت دین اور اقامت دین میں اپنا قیمہ ہی کروانا پڑتا ہے!) بی اے بی ٹی تعلیم تھی، بچپن میں گلے کی ٹی بی کی وجہ سے گھر کے کاموں سے دور رہیں، ترجمان القرآن کے مطالعہ نے اجتماعیت اور فریضہ اقامت دین کی اہمیت واضح کی۔

رکنیت کا فارم فل کرنا محض کاغذ کا پیٹ بھرنا نہیں بلکہ ایک کٹھن راستے پر سے گذرنا ہے۔ پہلی رکن رکنیت کا فارم کیسے فل کرتی ہیں۔''

''رکنیت اختیار کرنے سے پہلے ایک ماہ تک ہر رات جاگ کر یہ سوچتی کہ میرے شریک جماعت ہونے سے جماعت کو کیا فائدہ ہوگا! اپنی معذوریاں، کمزوریاں سامنے آکر پیچھے دھکیلتی رہیں۔ دل نے کہا جماعت کا بھلا ہو یا نہ ہو خود تو روز قیامت سرخرو ہوسکوں گی۔''

چار سال تک شہروں کے دورے کئے، خطوط کے ذریعہ رابطہ رکھا، ہر صورت میں شام سے پہلے گھر واپس آتیں اور کہتیں کہ ''ہماری خیر اسی میں ہے کہ ہر کام کرتے وقت خدا کی پسند کو ملحوظ رکھیں۔''

دعوت دین کا آغاز نو باتوں والی حدیث سے کرتیں اور فرماتیں۔ ''ہماری بات چیت کا موضوع اللہ، رسول اللہؐ اور جنت دوزخ ہونا چاہئے۔''

ان کی کارکردگی کی رپورٹ کو 1947ء میں میاں طفیل محمد صاحب نے بطور نمونہ جماعت اسلامی ہند کی رپورٹ میں پیش کیا۔

بلا کی مردم شناس تھیں ہر کسی کو اس کی صلاحیت جانچنے کے بعد ذمہ داری دیتیں آپ کے پیارے رسالے ''بتول'' کا آغاز انہوں نے ظاہری طور پر کوئی سرمایہ نہ ہوتے ہوئے ''بس اللہ کے نام'' سے ہی کیا۔ البتہ شرائط کڑی تھیں کہ محض رضائے الٰہی کے لئے لکھا جائے پرچے کی اشاعت میں اضافے کے لئے مختلف مشورے دیئے جاتے۔ کہا، جس روز مادی فائدہ اخلاقی فائدے سے آگے آیا پرچے میں خیر و برکت ختم ہوجائے گی۔

نفسیات شناس تھیں، لکھتی ہیں ''حقوق ادا کرنے کے سلسلہ میں یہ کوئی شرط نہیں جس کے حقوق ادا کرنا ہمارے ذمہ ہو وہ لازماً نیک اور محبت کرنے والا ہو، یہ تو قرض کی مانند ہے جس کے لئے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جس کا قرض دینا ہے وہ نیک ہے یا بد، بس اس کا قرض اتارو''

ادارہ بتول سے از حد لگاؤ تھا۔ ادارے کی منیجر بھی تھیں رسالے کی مدیرہ بھی، کلرک بھی اکاؤنٹنٹ بھی۔ سارا دن چار چار حیثیتوں میں کام کرتیں اور کہتیں مجھے تو کام نے تندرست کردیا۔ قارئین اگر ''اوصاف حمیدہ'' کا تذکرہ کروں تو کالم ختم ہوجائے۔ عبادت و ریاضت کے علاوہ سیرت و کردار میں مثال تھیں، تحریکی کاموں کے لئے توکل خشیت کے علاوہ جن خوبیوں کی ضرورت ہے ان سے مالا مال تھیں۔

حلقہ خواتین کی دوسری سربراہ ام زبیر تھیں۔ متحرک، فعال، طبیعت میں شوخی، خطبات کو پڑھنے کے بعد جماعت کی دعوت پر لبیک کہا۔ (ہم صرف آنکھوں سے پڑھتے ہیں، انہوں نے دل سے پڑھی ہوگی) ان کے سامنے ہر وقت ''وقت کم مقابلہ سخت'' کا مقولہ موجود رہتا، متوسط گھرانے سے تعلق تھا۔ مصروفیات کا انبار موجود رہتا۔ ہاتھ کام کرنے میں، ذہن سوچنے میں اور زبان ذکر الٰہی میں مصروف۔ ایک چولہے پر ہنڈیا پک رہی ہے دوسرے پر روٹی، ساتھ ہی کپڑے دھل رہے ہیں، کچن میں قلم کاغذ بھی موجود ہیں جہاں اچھا جملہ ذہن میں آیا لکھ ڈالا..... ہر کام بہترین ہوتا۔ سیماب صفت تھیں۔ ان کا معمول تھا نماز فجر کے بعد سب کو ناشتہ کرا کے کھانے کی تیاری شروع کردیتیں ساتھ ساتھ کپڑے دھل رہے ہیں، سوکھے کپڑے تہہ کر کے تکیے کے نیچے رکھے جارہے ہیں تاکہ استری کی ضرورت نہ پڑے۔ کام ختم ہوا تو پڑوس میں ملاقاتوں کے لئے چلی گئیں کتابیں دیں، گھر آکر فون کئے، مضامین لکھنے بیٹھ گئیں، بیچ بیچ میں حفظ قرآن، نوافل، مطالعہ لٹریچر جاری رہتا، تازہ اخبارات و رسائل کا مطالعہ بھی لازمی تھا۔ جس خبر کے لحاظ سے ہر وقت حکومتی سطح پر موقف پہنچانا ہوتا فوراً نقطہ نظر پہنچا دیتیں، ہر وقت باوضو رہتیں خاندان میں بڑی بیٹی اور بڑی بہو ہونے کے ناطے سارے تعلقات اور فرائض نبھائے۔

کراچی میں حلقہ خواتین کا اجتماع تھا سخت بخار میں مبتلا، دانت سارے نکلوا کے آئی ہیں، جانے کی تمنا ہے، منع کیا تو کہا، حاضری تو ہو جائے گی بس وہاں لے چلو جلسے میں اسی حالت میں شریک ہوئیں پھر سٹیج پر پہنچ گئیں، مائیک تھام لیا اپنے عزم کو سامعین تک منتقل کرنا چاہا تو دانت نہ ہونے کی وجہ سے پھپ پھپ کی آواز نکلی، پھر عزم جیت گیا، معذوری ہار گئی۔ بعد میں خوشی سے بیٹی کو بتایا ''میرے رب نے تو وعدہ کیا ہے میں اپنے بندے کا ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں آج آنکھوں سے دیکھ لیا

میرا رب میرے دانت بن گیا اور تقریر کرواڈالی۔''

اولاد کی طرف سے ہر طرح کی آزمائش سے دوچار رہیں لیکن غلبہ دین کی تمنا ہی سب پر غالب رہی۔

8 اگست 1917ء کو مالیر کوٹلہ میں پیدا ہونے والی نیر بانو تیسری سربراہ تھیں۔ بھوپال میں خالہ (خرم مراد مرحوم کی والدہ) کے ہاں گئیں اور مولانا کی کتب پڑھ کر ذہن بدل گیا 1981ء سے 1987 تک دو سیشن میں سربراہ رہیں، تفکر، تدبر، حکمت اور فہم وفراست کی دولت سے مالا مال تھیں۔ ہر میدان میں ماہر تھیں، اچار، چٹنیاں، مربے سب گھر میں بنتے، سلائی اتنی نفیس کہ ہر ٹانکا ہموار، لحاف بنانا ڈورے ڈالنا، چارپائیاں بنانا، نواڑی پلنگ تیار کرنا، کیاریوں، گملوں میں پھول اگانا، ان میں گوڈی کرنا، مرغیاں پالنا، کشیدہ کاری، سوئٹر بننا، کروشیا، ہر کام میں سلیقہ مند۔ ان کا کہنا تھا ''ہنر اور سلیقہ عورت کا زیور ہے، گھر اس کی سلطنت ہے جس کی وہ بے تاج ملکہ ہے۔'' میاں پولیس میں تھے نیر بانو کو حرام مال سے نفرت تھی۔ جماعت میں شمولیت کی اجازت دینے سے میاں انکار کرتے تھے حکمت اس درجہ تھی کہ بچہ پیدا ہوا، میاں نے پوچھا کیا تحفہ دوں، کہا اجتماع میں شمولیت کی اجازت دے دیں۔

صالح و پاکیزہ ادب کے فروغ کے لئے ان کے زمانے میں حریم ادب کا قیام عمل میں آیا۔ مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم کیں اس طرح لکھنے والیوں کی کھیپ تیار کی۔ انہوں نے ناول، افسانے، مضمون ہر صنف میں لکھا، اتنا لکھا کہ آخر عمر میں انگلیاں ٹیڑھی ہوگئی تھیں کئی دفعہ کہتیں ''ان ہاتھوں نے اللہ کی محبت اور خلق خدا کی اصلاح کے لئے لکھا اللہ قبول فرمائے۔''

جماعت میں کارکن سازی اور کارکنان کی تربیت ان کا خاص ہدف تھا (اس کی یہ ناچیز گواہ ہے) جماعتی نصاب مرتب کرنے اور بھجوانے کا کام بھی شروع کیا۔

زندگی کے ہر شعبہ پر نظر تھی۔ نوجوان لڑکیوں پر خصوصاً توجہ دیتیں اور انہیں اصل سرمایہ سمجھتیں حلقہ خواتین کے تحت ملنے والے تعلیمی اداروں کے نیٹ ورک ''المحصنات'' کی تعمیر میں ہر طرح سے پیش پیش تھیں۔ طویل عمر پائی۔ آخری وقت میں **رب اغفروارحم وانت خیر الراحمین** کا ورد رہتا، رشتوں کی پہچان بھول گئی تھی مگر ان کے سینے میں قرآن موجود تھا۔

قارئین کتاب میں پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں دین حق کو روشناس کرانے والی بائیس خواتین کا تذکرہ موجود ہے ہر خاتون ہی روشن نگینہ اور آبگینہ ہے لیکن اس خاتون کی عظمت کے کیا کہنے جو خود بھی قدرت کے چیدہ لوگوں میں سے ہے اور وقت کے سب سے بڑے مجدد کی ہمسفر بھی ہے۔ وقت کے امام کی ہمسفری آسان کام نہیں، اس کے لئے بے تحاشا صبر، وقت کی پابندی، مقصد سے لگاؤ ضروری ہے۔ سید مودودیؒ اعتراف کرتے ہیں '' جب لوگ نعرے لگاتے ہیں مولانا مودودی زندہ باد، جماعت اسلامی زندہ باد تو میں دل میں نعرہ لگاتا ہوں محمودہ بیگم زندہ باد.....'' اب انکے کردار کی ایک جھلک کہ صفحات کم اور مواد زیادہ ہے۔

آپ نے اپنے اوقات کو مولانا کے اوقات کے ساتھ منضبط کرلیا تھا، مولانا کا کام ان کی گھڑی کے ساتھ بندھا ہوتا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد ٹوپی رکھنے اندر آتے تو چائے کا کپ ہاتھ میں لیے کھڑی ہوتی تھیں۔ لمحہ بھر کی تاخیر گوارہ نہ تھی کہ باہر عصری مجلس شروع ہوتا تھی۔

محمودہ بیگم کا حوصلہ چٹانوں سے زیادہ تھا سید مودودی کی پھانسی کی خبر اخبار میں پڑھ کر اخبار چھپا دیا مبادا بچے پریشان ہوں اور سکول کا ناغہ ہو جائے۔ ان کے رشتے کے لئے خواب اور حالات سب پڑھنے کے قابل ہیں عربی محاورے کے مطابق ''البنات عود'' میں سے تھیں ایسی خاتون جو خود تو پردے میں رہتی ہے لیکن اپنے کردار کی خوشبو سے ماحول کو مہکا دیتی ہے۔

1896ء میں ہوشیار پور میں پیدا ہونے والی مغلیہ نزاکت اور فاروقی رعب دبدبے کے وصف رکھنے والی کرم النسا (امی جی) میں بھی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو دین کے داعی میں ہونی چاہئیں لیکن عورت کی تمام خوبیوں پر پانی پھر جاتا ہے اگر وہ ازدواجی زندگی میں مشکلات کا شکار ہو۔ یہاں بھی مشکلات کی نوعیت ہی عجیب ہے کہ خاوند بیرسٹر اور پکا

کمیونسٹ۔ایسے میں فرض منصبی ادا کرنا جوئے شیر لانا ہے۔یہ کٹھن وادی کس طرح عبور کی، ہر عورت کو پتہ ہونا چاہئے جو شوہر کی ذہنی ناموافقت کا شکار ہے۔

بنت ظفر اقبال، نسیم آرا، رفعت، مسز حنیف یہ سب اس متقی خاتون کے نام ہیں جنہیں آپ بنت الاسلام کے نام سے جانتی ہیں 1973ء میں ماہنامہ بتول کے مشاورتی فیصلہ سے رسالے کی مدیرہ منتخب ہوئیں، حسن صورت اور سیرت دونوں سے آراستہ تھیں درس ہو یا تحریر عام فہم اور سادہ زبان استعمال کرتیں، افسانے، ناول مضامین سب صنف ادب سے انصاف کیا۔سیرت پر لکھی کتاب پر صدارتی ایوارڈ دیا گیا۔لاہور کالج فار ویمن میں پڑھاتی تھیں، طالبات کے ساتھ رویہ اتنا مشفقانہ ہوتا کہ لڑکیاں ان کی کلاس میں آنے کے لئے ضد کیا کرتیں۔ایک ساتھی استاد بتاتی ہیں ایک بار میں نے ان سے کہا اسلامیات اختیاری کی کلاس میں بہت لڑکیاں ہوگئی ہیں مزید کا داخلہ بند ہونا چاہئے، تو کہنے لگیں ''نہیں مت روکو ان کے لئے تو میں نے اتنی دعائیں مانگی ہیں، میں تو کلاس کی ہر لڑکی کے اضافہ پر دو نفل شکرانہ ادا کرتی ہوں، ایسا بنک تھیں جہاں لوگ اپنے تفکرات اور مسائل جمع کرواتے سکون اور اطمینان کیش کروایا کرتے، بحیثیت معلّمہ، بہن، بیٹی اور ماں کے مثالی خاتون تھیں لیکن ان کی ایک اضافی خوبی، پوری امت مسلمہ کا درد تھا۔

جب سنگلاخ زمینوں میں خدا کی دعوت کے علمبردار پیدا ہوں تو وہ کیسے ہوتے ہیں یہ مردان کے دیہات میں پیدا ہونے والی احمدیہ بیگم کے حالات زندگی سے پتہ چلتا ہے جماعت کے رہنما فضل معبود صاحب کی ہمشیرہ تھیں۔دونوں بہن بھائیوں نے دل جیت لینے والے اخلاق کے ساتھ کس طرح کام کیا یہ پڑھ کر رشک آتا ہے۔

قارئین اب گرد، گرما، گداو گورستان سے تعلق رکھنے والی وہ عظیم خاتون جو حد درجہ منکسر المزاج، وفادار بیوی اور مقصد سے والہانہ لگاؤ رکھتی تھیں۔بیٹی کہتی ہیں ماں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے میں کہتی، میری طبیعت خراب ہے مجھے لگتا ہے میں مر جاؤں گی، تو بجائے اس کے کہ میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر ''اللہ نہ کرے، کہتیں جواب دیتیں کلمہ اور دعائیں پڑھ لو، چھوٹے بچے تو جنت کے پھول ہوتے ہیں امی ابو کے لئے جنت کا ٹکٹ ہوتے ہیں، بڑے ہو کر تو پتہ نہیں کتنے گناہ یا غلطیاں ہوں گی پھر وہاں تو نبی کریمؐ ہوں گے، حضرت عائشہؓ ہوں گی انبیائے کرام ہوں گے۔''

علمی اور ادبی ذوق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا بچپن میں بچے کوئی بات پوچھتے تو جواب شعر کی صورت میں دیتیں صرف ملتان ہی نہیں ملتان کے گرد و نواح کے تمام شہر (میں بھی انہی متاثرین میں سے ہوں) ان کے دعوتی مشن کے گواہ تھے، وہاں کے دورے کرتیں، بچیوں کو مقصد زندگی سے منسلک کرتیں۔

یہ کانٹوں پھولوں کا گلبن..... یہ دنیا جو ہے اک گلشن
اس گلشن کی میں نکہت ہوں.....میں عورت ہوں میں عورت ہوں

یہ خوبصورت شعر کہنے والی کی شخصیت شعر سے بھی زیادہ خوبصورت تھی بنت مجتبیٰ مینا، صابرہ، شاکرہ، حیادار، خوددار، ایثار پسند دوسروں کو آگے کرنے والی، خود پیچھے رہنے والی (یہ ناچیز بھی انہی کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے قلم کے میدان میں آئی) میدان ادب کی رہنما لکھاری تھیں بچوں کے رسالہ نور کی عرصہ دراز تک ایڈیٹر رہیں اور اس میں ''ریڈیو نورستان'' کے نام سے بچوں کا پسندیدہ کالم شروع کیا جو چھ سو پروگراموں تک چلا بچپن میں ٹک ٹک ٹک، السلام علیکم یہ ریڈیو نورستان ہے، میرا پسندیدہ جملہ تھا۔ان کا حسن اخلاق ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنانے والا تھا۔آخری وقت میں پورے ہوش سے کلمہ طیبہ زبان پر جاری تھا۔

قارئین انگوٹھی کا ایک ایک نگینہ اپنی جگہ پر بے مثال ہوتا ہے کتاب کی ہر ہستی ہی جگمگ کرتی ہے خواہ عزیز آباد کی روشن نسرین ہوں جو بے پناہ خدمت خلق کے ذریعہ لوگوں کو رب سے جوڑتی ہیں، انڈسٹریل ہوم قائم کرتی ہیں یا بدر النساء (ام اکبر) جو ہر شعبہ میں دین کی مجاہدہ تھیں شکر، قناعت کے زیور سے آراستہ تھیں تحریر کے محاذ پر چوکھی جنگ لڑنے والی، باخبر، فعال اور ہمہ صفت موصوف تحفے تحائف دینا بہت پسند تھا۔دلوں میں جگہ بنانے کا ہنر جانتی تھیں۔گوشہ عافیت بے سہارا خواتین کی پناہ گاہ) کی نگرانی چیلنج سمجھ کر قبول کی۔شہادت حق کا اتنا

احساس تھا کہ ہوائی سفر میں بادلوں میں گذرتے ہوئے بادلوں کو دین کی سربلندی کے لئے گواہ بناتی ہیں۔

کتاب کی اگلی پاکیزہ ہستی زبیدہ صلاح الدین کی ہے۔قرآن سے محبت میں دستگیر سے دوبسیں بدل کر ناظم آباد اور پھر لمبی مسافت کے بعد درس گاہ میں پہنچتی ہیں۔خاندان کے لیے شجر سایہ دار تھیں۔کمر کے مہروں میں شدید تکلیف تھی اور بیٹھنے سے قاصر،اس حالت میں بھی شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لئے کراچی سے لاہور کا سفر ٹرین سے کیا اور پورے اجلاس میں لیٹ کر شرکت کی۔

کراچی سے ہی تعلق رکھنے والی عذرا آپا، داعیانہ حکمت سے سرشار تربیتی میدان ہو یا تنظیمی، ہر ایک میں یکتا۔حیدرآباد دکن میں آنکھ کھولنے والی فیض النساء آپا ہوں یا مرکزی بیت المال کی امین صفیہ ناہید، سب کے ضمیر میں اللہ اور رسولؐ کے بعد دعوت دین سے محبت شامل تھی یہی روشن ستارہ جب فضائے مغرب میں پہنچتا ہے تو ICNA کی صورت میں چمکتا ہے اور اس کی آب و تاب سے ہر ایمان والا دل منور ہوجاتا ہے۔

قارئین جن خواتین کے حالات زندگی بیان ہونے سے رہ گئے وہ بھی قابل رشک ہیں،لیکن نا قابل یقین نہیں۔سکھر کی کلثوم عبیدی انفاق فی سبیل اللہ میں آگے ہیں تو بلوچستان کی میمونہ رضوی وسائل نہ ہونے کے باوجود ہر دم چوکس، لاہور کی مسعودہ افضل اگر باہمی تعلقات میں ''سراپا الفت'' ہیں تو کراچی کی مشعل پروین ترجیحات کا تعین کرنے کے بعد کام کرنے والی، بہترین مہمان نواز اور ہمہ صفت موصوف۔لاہور کی ڈاکٹر عذرا بتول، ذہین وفطین، عزم وہمت میں سب سے آگے عائلی زندگی میں ایسا کردار کہ پڑھتے ہوئے آنکھیں نم ہوجائیں، دل رشک سے بھر جائے، سراپا ایثار، محبت ومودت۔کتاب کے آخری صفحات نور جہاں کنول کی داستان حیات پر مشتمل ہیں، عملی زندگی میں یہ سب راہنمائی کرنے والی مرشد خواتین ہیں، کتاب کی طباعت، گیٹ اپ ہر چیز عمدہ نہیں بہت عمدہ ہے۔کتاب پڑھتے ہوئے بارہا یہ مصرع ذہن میں آتا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اگلے کالم تک کے لئے اجازت، اپنی عمومی اور خصوصی دعاؤں میں یاد رکھیے۔فی امان اللہ۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر فلزہ آفاق

اللہ کے حکم میں بھلائی ہے!

میں نہ تو کوئی مفتی ہوں نہ عالمہ، بلکہ کائنات کے خالق و مالک اور اپنے بندوں سے بے حد محبت کرنے والے رب کی ناچیز بندی اور اسکے دین کی طالبۂ علم ہوں۔ موجودہ دور میں جہاں بہت سی متفق چیزوں کو اختلاف کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، وہاں پردے کے موضوع پر بھی مختلف آراء سامنے آتی رہتی ہیں۔ مختلف علمائے کرام کی علمی بحث ایک طرف کہ کتنا پردہ فرض ہے، واجب ہے یا مستحب، میرا دل و دماغ اور زندگی کا تجربہ پوری طرح اس کی ضرورت و اہمیت پر گواہی دیتا ہے۔

الحمدللہ کہ ہمارے رب نے ہمارے لئے نہ صرف زندگی کی بے شمار نعمتیں مہیا کیں (جو ہر خاص و عام کو حاصل ہیں) بلکہ زندگی گزارنے کا طریقہ بھی ایسا بہترین عطا کر دیا کہ ہم جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔ بقول بنت الاسلام صاحبہ کہ جس چیز میں ہماری بھلائی تھی، رب نے اسے فرض کر دیا اور جس چیز میں بنی نوع انسانیت کا نقصان تھا اس نے منع کر دیا۔ یہ تو میرے اور آپ کے لئے خیر ہی خیر ہے، بھلائی اور فلاح ہے۔ بس ہماری ہی طرف سے غفلت ہے، لاپروائی ہے، سستی ہے، رب کی عطا میں تو کوئی کمی نہیں جب میں سوچتی ہوں کہ رب کے حکم سے پردہ اختیار کرنے کے بعد مجھے زندگی میں کتنی آسانیاں ملیں، کتنی مشکلات سے میں بچ گئی تو اس دین پر یقین اور بڑھ جاتا ہے جو ہم سب کے لئے صراط مستقیم ہے۔

جب مختلف کاموں کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑتا ہے، خریداری کرنی ہے یا بل ادا کرنے ہیں، یا کوئی دفتری کام ہے تو پردہ جو احساس تحفظ عطا کرتا ہے اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا بحیثیت ایک کم عمر ڈاکٹر کے، جب پہلی دفعہ میل وارڈ میں نائٹ ڈیوٹی لگی تو میرے ساتھ ایک کم عمر زیر تربیت نرس کی ڈیوٹی تھی جو مجھ سے بہت چھوٹی تھی۔ الحمدللہ اس پردے نے جو عزت، وقار، احترام عطا کیا، اس کی وجہ سے بلا خوف اور اعتماد کے ساتھ کئی سال ہسپتال میں نہ صرف مریضوں بلکہ انکے لواحقین کے ساتھ بھی جو واسطہ پڑا اس میں پردہ رکاوٹ بننے کی بجائے معاون بنتا رہا۔ اور یہی میری اور بہت سی بہنوں کا تجربہ ہے۔

ہاؤس جاب کے بعد پہلی پوسٹنگ ایک رورل ہیلتھ سنٹر میں ہوئی جو ایک ویرانے میں بنا تھا۔ سوا سال بعد جب میں وہاں سے واپس آ رہی تھی تو خواتین کی ایک سٹاف ممبر نے مجھے بتایا کہ آپ کے آنے سے پہلے سارے ہسپتال کا سٹاف سینئر ڈاکٹر کے کمرے میں اکٹھے چائے پیتا تھا، جب آپ کے آنے کا پتہ چلا تو ہم نے اسی وقت یہ فیصلہ کیا کہ اب ہم خواتین چائے علیحدہ پیا کریں گی (حالانکہ مجھ سے پہلے ایک خاتون ڈاکٹر بھی سٹاف میں موجود تھیں)۔ الحمدللہ، پردہ ایک خاموش پیغام ہے اور اس کی وجہ سے وہ بہت مشکل وقت آسانی سے گزر گیا۔

چونکہ میں نے طالبات کے ایک ادارے سے میڈیکل کی تعلیم اس لئے پردے کی اہمیت کا سب سے زیادہ احساس مجھے تب ہوا جب میں پوسٹ گریجویشن کے لئے ایک دوسرے ادارے میں گئی، وہاں کلاس روم کی تربیت، کانفرنس روم کی طرح تھی اور سب کو آمنے سامنے بیٹھنا ہوتا تھا۔ وہاں پہنچ کر میرا دل احساسِ تشکر سے بھر گیا میرے رب نے اپنے اس حکم کے ذریعے آسانی عطا کی (اور بھی بہت سی آسانیاں ہیں مثلاً وقت کی بچت..... کہ برقعہ پہنا اور چل دیئے) میری ناچیز رائے میں جب پردے کے وجوب کے لئے "معاشرتی خطرات" کی بات کی جاتی ہے، جیسا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے 20 اکتوبر 2015ء کے بیان میں کہا گیا ہے تو یہ خطرات گھریلو خاتون خانہ کے لئے شاید تو کم ہونگے مگر جس طرح آج خواتین گھروں سے نکل رہی ہیں، خواہ ضرورتاً یا دین کے کسی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے یا جائز دینی ضروریات کے لئے.....اور جس طرح معاشرے میں بے حیائی اور فحاشی کو پھیلانے والا لٹریچر، پروگرام، ویب سائٹس، تعلیمی اداروں تک میں اس کلچر کی حوصلہ افزائی عام ہو رہی ہے، وہاں پردہ ایک بڑی حفاظتی ڈھال ہے، ان معاشرتی خطرات کے مقابلے میں اس کے ساتھ ضروری یہ ہے کہ پردے کا یہ احساس شعوری بھی ہونا چاہئے۔

☆.....☆.....☆

محشرِ خیال

ایک خط اور اس کا جواب

ہجری سال کی مبارکباد کے ساتھ خط کا آغاز کرتے ہیں۔ اکتوبر کا بتول خلاف معمول ۱۳ تاریخ کو ہی مل گیا تو تبصرہ نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ پھر بھی ہم ٹال جاتے لیکن کیا کریں کہ ہماری تحریر پر مدیرہ کے نوٹ نے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں پر یہ وضاحت ہو کہ اجتماع عام کے بعد سے مدیرہ سے کوئی رابطہ نہیں ہوا ہے! ماسوائے تحریر بھیجنے کے بعد میل چیک کرنے کے مختصر سے پیغام اور جوابی پیغام سے! (اس وضاحت کی ضرورت یوں پڑی کہ جس معاشرے میں امتحانی پوزیشن سے لے کر اسمبلی کے ٹکٹ تک لیے دیے بغیر ممکن نہ ہوں وہاں ضرور شبہ کی گنجائش رہتی ہے.....!)

جس شہر میں ہیرے اور ردّی ایک ہی مول دستیاب ہوں وہاں اگر ایک جوہری بھی کھرے کھوٹے کی پہچان کی خوبی رکھے تو بڑی بات ہے! صائمہ اسماء کی جانب سے اپنے آپ کو جینوئن لکھاری کی فہرست میں پا کر جہاں خوشی ہوئی وہیں تشویش بھی کہ آج کل اصلی اور خالص کا زمانہ کہاں؟ نہ ہضم ہوتی ہیں نہ برداشت! اوسطاً ہر دوسرے ماہ ہماری کوئی نہ کوئی تحریر بتول میں شائع ہوتی ہے مگر مجال ہے کسی قاری کی طرف سے کوئی تبصرہ، تنقید یا ذکر ہی ہو جائے! تبصرہ ضروری نہیں کہ تعریف ہی ہو بلکہ تنقید، اسکرپٹ سے لے کر کرداروں تک، مناظر سے لے کر تھیم تک.....حتیٰ کہ کوئی یہ ہی کہہ دے کیا بکواس لکھی ہے.....!

ایک جملے کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے۔۔۔ چند الفاظ کا مجموعہ! مگر وہ محرک بن جاتا ہے کسی کی حوصلہ افزائی کا جو قلمکار کو کسی نئی تحریر کے لیے تر و تازہ کر دیتی ہے۔ لفظوں کے موتیوں سے مالا بنانا کوئی آسان کام نہیں۔ دانتوں تلے پسینہ آ جاتا ہے مگر قارئین کے سر پر جوں تک نہ رینگے تو..! ڈیل کارنیگی کی کتاب میں برسوں پہلے پڑھا وہ واقعہ یاد آ جاتا ہے جب ایک بیوی اپنے شوہر کے آگے کھانے کی پلیٹ میں گھاس رکھ دیتی ہے تو وہ چونک پڑتا ہے اور بیوی رو پڑتی ہے کہ برس ہا برس سے کھانا پکا رہی ہوں کبھی کوئی تبصرہ نہیں.....! اس واقعے کی جزئیات ایک طرف..... کہنے کی بات صرف اتنی کہ لاتعلقی انسان کو demoralize کر دیتی ہے!

کچھ عرصے پہلے یہ ہی بات قانتہ رابعہ نے کہی تو ہم نے ان کا دکھ محسوس کیا کہ جو تحریر سوچ کے زاویے اور عمل کی راہیں متعین کرے کیا اس کا اتنا حق نہیں بنتا کہ اسے تبصرے کی چھلنی سے گزارا جائے؟ لکھاری نہ کسی ایوارڈ کا تقاضا کرتے ہیں نہ کسی نوبیل پرائز کا! ہاں بس ایک التفات کی نظر چاہیے۔

خواتین کے تقریباً تمام ڈائجسٹ اور میگزین وغیرہ میں خطوط کا سلسلہ ہوتا ہے جو قارئین اور لکھاریوں کے درمیان باہمی تعلق پیدا کرتا نظر آتا ہے اور کہانیوں افسانوں سے زیادہ دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ بتول میں بھی محشرِ خیال کے عنوان سے ایک محفل ہر ماہ سجائی جاتی ہے جو سراسر قارئین پر انحصار کرتی ہے مگر شاید وہ اسے میدانِ حشر سمجھ بیٹھتے ہیں جہاں لب کشائی کی اجازت ہے نہ ہمت! حالانکہ یہ کاوش اور کوشش خود قارئین کی تحریری صلاحیت میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ آزمائش شرط ہے!

خبروں پر بھی خاصا سنسر نظر آتا ہے۔ اب دیکھیں صائمہ اسماء کے ساس بننے کی خبر ہمیں رفتار (ششماہی) سے معلوم ہوئی۔ برسبیل تبصرہ کسی تقریب کی روداد میں ذکر تو آیا تھا مگر تفصیل سے محرومی رہی تھی....کیا بتول کے قارئین سے یہ بات نہیں شیئر کرنی چاہیے؟ قانتہ رابعہ کی بیٹی کی شادی کی خبر پڑھنے کو بھی ہماری آنکھیں ترسیں ....شاید کسی ان دیکھی لکھائی میں لکھا گیا ہو تو نہیں کہا جا سکتا! یہ ٹھیک ہے کہ ذاتی تشہیر مناسب

نہیں مگر باہمی تعلق کا کوئی تو ذریعہ ہونا چاہیے۔تعلق جو شریعت بھی ہے اور سنت بھی! ہم اپنے آپ کو ٹرینڈ سیٹر کہتے ہیں مگر کون سے؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ باہمی ربط کے ذرائع ضرور بہتر بنانے کی ضرورت ہے! بلاشبہ ملاقاتیں اور خطوط تصویروں کا نعم البدل بن سکتی ہیں! رائٹرز کنونشن کوئی راکٹ سائنس نہیں، ہمارے ماضی کی روایات میں شامل ہے۔2017ء میں بتول ساٹھ سال کا ہوجائے گا! کیوں نہ اس موقع کو ایک یادگار تقریب میں ڈھال دیا جائے!

ستمبر کے شمارے میں ثریا اسماء نے اپنے نام لکھا گیا آپا حمیدہ بیگم کا خط شائع کیا۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔آپ کی شادی میں تو ہم شریک نہیں ہوسکے تھے ثریا آپا مگر ہم نے آپ کے رشتہ طے ہونے کی خبر پڑھ لی (یہ بات کہنے کے لیے فون کیا تھا مگر رابطہ نہ ہوسکا تھا)۔خبر اور تاریخ میں زبردست تعلق ہے! جو بات باپ کے لیے خبر ہو وہ بیٹے کے لیے تاریخ ہوتی ہے اور ماضی وہ آئینہ ہے جس سے مستقبل کے خدوخال درست کیے جاسکتے ہیں (یہ بات ان لوگوں کے لیے ہے جو ماضی کو بھلانے کی تلقین کرتے ہیں!) اسی تھیم کے تحت اپنے حوالے سے تحریریں لکھنے کا ایک سلسلہ بلاگ (آن لائن ڈائری) کی صورت میں شروع کیا ہے۔جس تحریر کا ہم ذکر کررہے ہیں وہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جہاں ذاتی حوالوں سے بات کہنی پڑے تو میرے خیال سے مضائقہ نہیں! قرۃ العین حیدر سے لے کر اشفاق احمد اور میرزا ادیب تک یہ ہی انداز ملتا ہے۔ ذاتی تشہیر کی تہمت اپنی جگہ مگر حقیقت یہ ہے کہ اپنے بارے میں لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے!

آخری مگر اہم بات: حریم ادب کا بلاگ آپ کی توجہ کا منتظر ہے۔ جو بہنیں انٹرنیٹ استعمال کرتی ہیں ان سے التماس ہے کہ وہ اس کو ضرور وزٹ کریں اور تحریری، تکنیکی تعاون سے نوازیں۔اس کا لنک hareemeadab.blogspot.com ہے۔ جو بہنیں اپنی تحریر شامل کرنا چاہیں hareemeadab1@gmail.com پر بھیج سکتی ہیں!

اللہ ہماری تمام سعی و جہد کو قبول کرے کہ اس سے بڑھ کر نہ کوئی قدردان ہے اور نہ جزا دینے والا!

فرحت طاہر۔کراچی

☆

پیاری فرحت! آپ کے خط نے آنکھیں نم کردیں۔قارئین کے سامنے پردہ پوشی ہی رہے تو اچھا ہے۔دین کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والے لوگ خلقِ خدا میں بہتر اخلاق اور بہتر سمجھ بوجھ والے ہونے چاہئیں اور عالی ظرف بھی، اور یقیناً ایسا ہے بھی۔۔۔مگر نجانے کیوں، وہ جو رگوں میں خون بن کر دوڑتا ہے، اُس کی محبت پر غالب آجاتا ہے جو ہر دھڑکن میں ہے اور شہ رگ سے زیادہ قریب! دین کے نام پر بھی ہم گمراہ ہوجاتے ہیں۔اپنے دلوں کی تنگی کو تقویٰ اور حدیث کے لبادے پہنا دیتے ہیں اور عقیدت رکھنے والے اسی کو دین سمجھ لیتے ہیں۔ پھر وہی تصور عام ہوجاتا ہے، بلکہ نیکی بن جاتا ہے۔میرے خیال میں آپ کو خود بھی خوب مشاہدہ ہوگا۔۔۔عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں!!

ساٹھ برس ہونے پر تقریب کا انعقاد اچھا خیال ہے۔میرے خیال میں اس کی پلاننگ کے لیے آپ بھی مشورے دیں۔

قارئین سے تبصرہ نہ کرنے کے شکوے پر میں آپ کے ساتھ ہوں۔وقتاً فوقتاً توجہ بھی دلاتی رہتی ہوں۔مگر ڈائجسٹوں والی مثال شاید حسبِ حال نہیں ہے جہاں اکثر مجلسِ ادارت خود خطوط تحریر کرکے ایسے کالم مرتب کرتی ہے۔

قارئین کو یہ بھی بتادیں کہ فیس بک پر بتول کا پیج بن گیا ہے جسے شگفتہ بھٹی، فہمیدہ انجم اور ان کی معاونین چلا رہی ہیں۔ یہ ان کی اپنی ہمت اور کوششوں سے ممکن ہوا ہے۔بتول پڑھنے والے اس پیج کو شرفِ پسندیدگی بخشیں اور اپنے نیک مشوروں سے بھی نوازیں۔اس پیج کا نام Chaman-e- Batool Mahnama Lahore ہے۔

صائمہ اسما

آزادی، تجھے سلام!

عورتوں کی جیل میں ایک مقامی این جی او کی طرف سے درس وتذکیر کے سلسلے میں اکثر قیدی خواتین سے رابطے کا موقع مل جاتا ہے۔جشن آزادی کے موقع پر جیل کو بھی قومی پرچم اور جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ میں وہاں خواتین سے محو گفتگو تھی کہ اچانک گئی ہوئی لائٹ واپس آ گئی اور راہداری میں سجی جھنڈیاں آواز کے ساتھ پنکھوں کی ہوا سے پھڑ پھڑانے لگیں۔ایک جھنڈی ٹوٹ کر نیچے آ گری جس پر سفید وسبز قومی پرچم بنا تھا۔

درس سنتے ہوئے ایک قیدی عورت تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے جھنڈی کو اٹھا لیا۔اس کو آنکھوں سے لگایا اور نوٹ کی طرح تہہ کر کے مضبوطی سے مٹھی میں بھینچ لیا،لفظ حقیقتاً مجھ سے کھو گئے اور جملوں کا ربط بحال رکھنا مشکل ہو گیا۔جذبوں کے سامنے لفظ تو اکثر ہار جاتے ہیں۔اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔واقعی آزادی کی قدر قید و بند میں صعوبتیں اٹھاتی ان عورتوں سے کوئی پوچھے ! ہوا سے پھڑ پھڑاتی ان جھنڈیوں میں ایک ہی تو پیغام تھا بس کہ ''تم لوگ آزادی کی قدر کیوں نہیں کرتے۔چونکہ تم آزادی کی قدر و قیمت نہیں جانتے اس لیے اس کی ویسی قدر نہیں کرتے جیسا اسکا حق ہے اور قدریوں نہیں جانتے کہ تم نے اس آزادی کے لئے قربانی ہی بھلا کون سی دی ہے۔''

آزادی کا دن ، اگست کا مہینہ..... جو بار بار سوچوں کو انہی دائروں میں لے جاتا ہے کہ اس آزادی سے ہم نے حاصل کیا کیا۔اس آزادی کو حقیقی آزادی بنانے کے لئے ہمارا کردار کیا ہوگا،چونکہ آزادی ہمیں ورثے میں مل گئی،اس کے حصول کے لئے ہمارا بال تک بیکا نہیں ہوا اور.....ان قیدی عورتوں کی سب سے بڑی خواہش ہی آزادی ہے۔ کوئی انکے دلوں پر دستک دے کر پوچھے آزادی کا مفہوم،تو ان کے ہونٹوں کے حرکت میں آنے سے پہلے آنکھوں سے لگی آنسوؤں کی جھڑی آزادی کا مفہوم سمجھانے کو کافی ہے اور انسانوں کی بستیوں میں جہاں جہاں آزادی کی تحریکیں بپا ہیں ہم انکی قربانیوں کی داستانیں پڑھیں تو آزادی کی قدر و قیمت سمجھ میں آتی ہے۔اب تو وہ نسل بھی تقریباً ختم ہوگئی جو تحریک پاکستان میں دی گئی قربانیوں کی عینی شاہد تھی۔غلامی، ایک احساس ہی کا تو نام ہے۔

ایک میگزین میں رات ماجدہ سلیمان کی کہانی نہ پڑھتی تو شاید اگست کا احساس ادھورا رہ جاتا۔پچاس برس کی کمزور بینائی والی ماجدہ جو صہیونیت کی قید میں ہے!

غزہ کے جنوب مشرق کے ایک گاؤں میں رہنے والی یہ خاتون..... جو ظلم اور بہیمیت کی سیاہ رات ان پر طاری ہے،اس دردناک داستان کو چشم نم کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ!

''تم تصور کر سکتے ہو کس کرب سے مجھے گزارا گیا۔مجھے نوجوان بچوں کے سامنے برہنہ لٹا دیا گیا..... اس رات اسرائیلی فوج مسلسل فائرنگ کر رہی تھی آنسو گیس کے شیل برس رہے تھے ہم دونوں میاں بیوی نے طے کیا کہ ہم پناہ کے لئے اپنا گھر چھوڑ کر نہیں بھاگیں گے۔اسرائیلی فوج گاؤں پر زمینی حملے کی تیاری کر رہی تھی۔پچھلے برس 21 جولائی کا دن تھا۔گاؤں کی سڑک کے دونوں جانب گولہ باری ہو رہی تھی۔کسی کو اجازت نہ تھی کہ گھر سے باہر نکلے یا گھر میں داخل ہو سکے۔اسرائیلی بموں سے ہمارے گاؤں کے اطراف 163 بڑے گڑھے پڑ گئے تھے۔زمینی، فضائی حملے جاری تھے۔گاؤں میں زندگی بالکل مفلوج ہو چکی تھی،خاندان پھنسے ہوئے تھے ہمارا پڑوس کا گھر شعلوں کی نذر ہو چکا تھا۔ہم نے گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ہم نے اہم دستاویزات کچھ ضروری سامان ساتھ

لے لیا جیسے ہی میں گھر کے دروازے پر پہنچی اچانک ایک میزائل آن گرا۔اس خوفناک دھماکے نے مجھے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔دونوں ٹانگیں جگہ جگہ سے پھٹ گئیں، میزائل کا ایک ٹکرا میری بائیں آنکھ میں گھس گیا جس سے آنکھ ہمیشہ کے لئے ضائع ہوگئی۔میری ٹانگ کا گوشت اڑ چکا تھا۔میرا شوہر مدد کیلئے پکار رہا تھا اس کا کزن وہاں پہنچا اس نے ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھایا تا کہ میں سہارا لے سکوں ایک لڑکے نے اپنی شرٹ اتار کر دی تا کہ میں میزائل حملے سے پھٹ جانے والے کپڑوں کے باعث اپنی برہنگی چھپا سکوں۔میں بری طرح کراہ رہی تھی درد سے، کہیں سے طبّی امداد کی کوئی امید نہ تھی۔گولے پھٹ رہے تھے، بم گر رہے تھے۔ میں نے شوہر کو کہا وہ سفید پرچم لے کر گھر سے نکلے اور اسرائیلی فوج سے گولہ باری روکنے کی استدعا کرے۔

اس نے سفید پرچم ہاتھ میں لے کر دروازہ کھولا کہ ایک سنسناتی گولی اس کے سر کے پاس سے گذر گئی، اسی دوران تیس کے قریب فوجی ہمارے صحن میں گھس آئے جنہوں نے ہم پر گنیں تان رکھی تھیں۔انہوں نے میرے شوہر کو کہا پرچم پھینک دے اور اپنے سارے کپڑے اتار کر بے لباس ہو جائے۔اس نے ایسا ہی کیا، وہ مسلسل چیخ رہے تھے کہ گھر میں اور کون ہے نکالو، میرے شوہر نے کہا صرف میری زخمی بیوی ہے۔ فوجیوں نے کہا بیوی کو باہر لے آؤ۔اس نے بتایا وہ شدید زخمی ہے۔ انہوں نے کہا تمہارے پاس صرف پانچ سیکنڈ ہیں پھر تم دونوں مار دیئے جاؤ گے۔اس نے مجھے گھسیٹ کر لے جا کر برآمدے میں لٹا دیا۔فوجیوں نے مجھے بے لباس ہونے کا حکم دیا۔میں نے عبایا سے خود کو ڈھانپا ہوا تھا..... انکے حکم پر عبایا اتارتے ہی میں بے لباس ہوگئی.....فوجیوں نے ہم برہنہ میاں بیوی پر گنیں تان رکھی تھیں۔انہوں نے گھر کی ہر چیز اتھل پتھل کر دی۔کھڑکیاں توڑ دیں، برتن توڑ ڈالے باورچی خانہ کی ہر شے برباد کر دی کمرے میں دو عدد میٹرس دیکھ کر وہ آگ بگولہ ہو گئے کہ تم اس کمرے میں دہشت گردوں کو پناہ دیتے ہو۔وہ ہذیان بک رہے تھے کچھ نہیں سن رہے تھے.....ہم دونوں برہنہ کھلے میدان میں گھنٹوں اوندھے منہ لیٹے رہے، بھوکے پیاسے رہے، گھر کی عقبی دیوار کو دھماکے سے اڑا کر انہوں نے اپنے لئے دوسری طرف جانے کا راستہ بنا لیا۔کئی گھنٹوں بعد میرے شوہر سے کہا گیا اپنی بیوی کو اندر لے جاؤ، گھر کے اندر میں شدید زخموں کے ساتھ چار دن بغیر طبی امداد کے رہی، امدادی تنظیموں کی گاڑیاں براہ راست گولہ باری کی زد میں آتی رہیں اور انہیں موقع ہی نہ مل سکا کہ زخمیوں کو وہاں سے نکالیں۔میرے زخموں میں کیڑے پڑ چکے تھے میرا بھائی ڈاکٹر ہے جب وہ پہنچ سکا تو اس نے زخموں پر نمک ملا پانی لگایا۔پھر بالآخر ایک ایمبولینس کو گاؤں میں داخلے کا اجازت نامہ مل گیا انکو محض 20 منٹ دیئے گئے۔اس مختصر وقت میں زخمیوں کو لے کر انہیں گاؤں سے نکل جانا تھا۔بہت سے زخمی پھر بھی رہ گئے کیونکہ نہ ایمبولینس میں جگہ تھی نہ وقت کہ ان تک پہنچا جا سکے۔ مجھے جس کار میں ڈالا گیا اس میں چھ زخمی اور تھے۔مجھے جنوبی غزہ میں ناصر ہسپتال لے جایا گیا۔میری دائیں ٹانگ ٹوٹ چکی تھی، بائیں ٹانگ کا آپریشن کیا گیا میں ایک ماہ ہسپتال اور چھ ماہ گھر میں اپنے بستر پر رہی۔میرے شوہر نے گھر کی تباہ شدہ دیوار پھر تعمیر کر لی ہے بموں سے تباہ ہونے والی چھت دوبارہ بنانے کے لئے وسائل نہیں تھے اس لئے اسکو ایلومونیم سے ڈھانپ دیا ہے گاؤں کا تباہ ہونے والا کوئی گھر دوبارہ نہیں بن سکا ہے۔''

ماجدہ جو دیکھنے سے بالکل معذور ہے اپنی کہانی مکمل کر کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی اس کی ٹانگوں کا شدید درد ابھی باقی ہے..... اسکی بے نور آنکھیں خلاؤں میں آزادی کی صبح اترتے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔اس کی آزادی کی تڑپ نے اسکا عزم و حوصلہ بلند کر رکھا ہے۔آہ! یہ داستان پڑھ کر قلم میں مزید لکھنے کا حوصلہ نہیں سوائے اس کہ:

''آزادی تجھے سلام۔''

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

صفتِ الٰہیہ کا مظہر

آدم وحوا میں جو صفات ودیعت کی گئی تھیں وہ بحیثیت انسان کے برابر تھیں ۔ دونوں کا بحیثیت صنف کے الگ ہونا یہ تقاضا کرتا تھا کہ دونوں کی کچھ الگ حیثیت بھی ہو۔

مولانا رومؒ اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں کہ عورت کی حیثیت اللہ الخالق کی نظر میں اس لئے محبوب ہے کہ وہ ''ظل اللہ'' یعنی اللہ کا سایہ یا پرتو حق ہے ۔ خدا کی صفات کاملہ کا پرتو مجازی اعتبار سے ہر انسان میں رکھ دیا گیا ہے ۔ نائب الٰہی ہونے کی وجہ سے مرد وعورت دونوں صفات الٰہیہ کا مظہر ہیں لیکن ان صفات الٰہیہ میں سے ''خلاقی'' صفت کا مظہر عورت ہے جو ایک اضافی صفت ہے تمام انسان عورت کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں ۔ اللہ رب العزت نے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی قدرت کاملہ سے بغیر مرد کے پیدا کیا مگر عورت کی صفت خلاقی کی شان برقرار رکھی ۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ عورت گو کہ ایک حیثیت سے مخلوق ہے لیکن مجازی طور پر وہ خالق بھی ہے ۔ مردوں نے دنیا میں جتنے بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے اللہ رب العزت نے وہ سارے باکمال کام کسی نہ کسی عورت سے بھی کروالئے ۔ مگر یہ اُسی رب کی تقسیم ہے کہ اُس نے جو عظیم الشان کام عورت سے کروایا وہ کسی مرد کے حصے میں نہیں آیا وہ انسان کی تخلیق ہے جو کائنات میں خدا کی خلاقی کے بعد سب سے بڑا خلاقی عمل ہے ۔ مرد ہر قسم کے صناعی کام میں کمال پیدا کر سکتے ہیں لیکن ایک قطرے سے انسان بنانا ، اولیاء ، انبیاء ، صلحاء کو معرض وجود میں لانا عورت ہی کی ڈیوٹی ہے جو اللہ الخالق نے خود اس کے سپرد کی ہے ۔ ڈیوٹی اسی کو دی جاتی ہے جو اس کا اہل ہو ۔ اہم ڈیوٹی پہ فائز فرد کا مرتبہ بھی اتنا ہی بلند ہوتا ہے ۔

ماں کسی بھی قوم یا مذہب کو ماننے والے کی ہو، قابل احترام ہے ۔ اگر وہ مسلمان ہو تو اس کا درجہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے بعد خود خالق کائنات نے مقرر کر دیا ہے ۔ اپنے پیارے نبی حضرت محمدؐ نے فرمایا کہ ماں کا حق باپ سے تین گناہ زیادہ ہے ۔ اور مسلمان ماں کا درجہ یا اعزاز یہ نہیں کہ اس کے سر پہ کوئی تاج ہے یا کوئی خدم وحشم دائیں بائیں ہیں بلکہ وہ مقام ومرتبہ جس کی طلب ہی مقصود ومنتہا ہے، وہ مقام ماں کے قدموں میں رکھ دیا گیا ہے ۔ اتنا بڑا اعزاز اتنی اعلیٰ شان سبحان اللہ! مبارک ہو ان عظیم مسلمان ماؤں کو جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس عطا کردہ اعزاز کی لاج رکھی ۔ اور خوش بخت ہیں آج وہ مائیں جو اپنے رب کی اس عطا کی قدر دان ہیں ۔ جب اعزاز واکرام ملنے کی یقین دہانی ہو، خوشخبری مل چکی ہو اور پھر کوئی اس کا احترام نہ کرے قدر نہ کرے اس کو پانے کی حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے تو نقصان عطا کرنے والے کا نہیں ناشکر گزار اور ناقدری کرنیوالے کا ہی ہوتا ہے ۔ جب کوئی خود اپنی ذات کا عرفان نہ کرے تو دوسروں سے کیا گلہ کہ ''کوئی قدر نہیں کرتا۔''

امت مسلمہ کی ماؤ! جاگ جاؤ، اپنی قدر آپ پہچانو، ''ماں'' ہو تو ''ماں'' بن کے دکھاؤ، بچوں کی اپنی اولاد کو معرفت الٰہی عطا کرو ۔ آپ کی معرفت اللہ رب العزت خود کروا دے گا ۔ ایک ''الخالق'' ہے تو دوسری ہستی خالق ہے، کیا پیاری نسبت ہے ''ماں'' میں اور ''رب'' میں.....اور درمیان میں ''انسان'' ہے ۔ ''دونوں ہستیوں'' کے سامنے ایک ''ہستی'' ہے ۔ دونوں کے ذمے ایک انسان کی تخلیق ، آبیاری اور پرورش ہے ۔ ایک ''رب العالمین'' ہے اور ایک **ربّۃ البیتؔ** ہے ۔ دونوں ہی اپنی اپنی دنیا کا انتظام وانصرام کرتی ہیں ۔ دونوں ''انسان'' تیار کرتی ہیں ۔ ایک مالکِ کل اور مختار کل ہے اور دوسری اسی ''مختار کل'' اور ''مالک کل'' کی فرماں بردار ہے ۔ مجازاً اسی خالق ومالک کا پرتو ہے ۔ جبھی تو اللہ رب

العزت نے اپنی محبت، پیار، شفقت کی مثال دینے کے لئے اسی ہستی کا نام لیا جس کو اس نے اپنا پرتو بنایا۔ غفلت میں ڈوبی اپنی شان کی عظمت سے بے خبر مسلمان ماؤں کو آئینے میں اپنی وہ جھلک تلاش کرنی چاہئے جس میں صفات الٰہیہ کا نور ہو، وہ نور جو رب العالمین نے ان کے باطن میں رکھ دیا ہے۔ مولانا اشرف علیؒ تھانوی نے کلید مثنوی کے اندر اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ ''عورت (ماں) کی تشبیہہ بالخالق اور مظہریت صفات الٰہیہ ہے۔''

☆☆☆